بسم اللہ الرحمن الرحیم

آگہی

آگہی

کلیاتِ تسنیم عابدی

الحمد پبلی کیشنز®
رانا چیمبرز۔(چوک پرانی انارکلی)۔لیک روڈ۔لاہور
042-37231490 - 37310944 0333-4645700

ہماری کتابیں .....
خُوبصورت، معیاری اور
کم قیمت کتابیں
تزئین واہتمام اشاعت
صفدر حسین

alhamd_publication@yahoo.com
www.facebook.com/alhamdpublication
ISBN:978-969-8988-87-6

ضابطہ:-

اشاعت : 2024ء
مطبع : زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور
سرورق : وسیم احمد نقوی
کمپوزنگ : محمد عاطف سعید
تعداد : پانچ سو
قیمت : 2000روپے

انتساب

اختر عابدی

اور اپنے بچوں بریر، زینب، زہیر، شیریں اور رجا عابدی

کے نام

جو حاصلِ زندگی ہیں

فہرست

☆ آ گہی کا تماشا — تسنیم عابدی — 25

صحرا آنکھیں اور تنہائی

-1 جب پلٹ آئے تو اس سے واسطہ رکھا نہیں — 29
-2 اک گھروندا تھا وہ بکھرا کیسے — 30
-3 تم زیست گزاری کا ہنر بھول نہ جانا — 31
-4 کیا وقت ہے ساقی کہیں، میخانہ کہیں اور — 32
-5 اک بابِ آ گہی جو کبھی مجھ پہ وا ہوا — 33
-6 اب اور نہ یوں تیرگیٔ دل کو بڑھاؤ — 34
-7 دل کے دِیے جلے تو دھواں ہو کے رہ گئے — 35
-8 زندگی کے باب حرفِ مختصر ہونے لگے — 36
-9 کچھ طبیعت مضمحل کچھ آنکھ بھی حیران ہے — 37
-10 عجیب میں ہوں عجب ہی مرا فسانہ ہے — 39
-11 سکوت میں بھی تھا اندازِ گفتگو جیسا — 40
-12 بے سود ہے وجود نہ ہستی نہ بُود ہے — 41
-13 اپنے بیمار سے یہ بے خبری کیسی ہے — 42
-14 کاش تم گھر کو بنانے کا ارادہ کرتے — 43
-15 ہم جو اک حرف تھے سوادا ہو گئے — 44

-16	شور میں اک روز گُم میری صدا ہو جائے گی	45
-17	اُداس لوگوں کو تم لوگ کیا ستاؤ گے	46
-18	پھول مرجھا جائیں گے کانٹے لگے رہ جائیں گے	47
-19	اشکوں کو چھپاتے ہیں سجایا نہیں کرتے	49
-20	تمھیں تھا زعمِ مسیحائی گھاؤ دیکھ لیا!	51
-21	دل کِھنچا جاتا ہے اس کی طرف ایسا کیا ہے	52
-22	درد جو دل سے لگا ہے وہ کدھر جائے گا	54
-23	آئی بہار پھول کھلا اور بکھر گیا	55
-24	درد رکتا ہے تو کچھ اور گھٹن ہوتی ہے	56
-25	تم میرے دردِ دل میں شراکت نہیں کرو	57
-26	صرف تخریب ہے تعمیر نہیں	58
-27	یوں صنم خانۂ دل کو سجائے رکھا	60
-28	غم ملا اس طرح کہ خوشی بن گیا	61
-29	پرانے خوابوں کی دستک کا پھر سبب کیا ہے	62
-30	خلش دل کی بڑھانا چاہتی ہوں	64
-31	بجھ گیا دل مگر گلہ نہ کیا	66
-32	ہٹ کے محور سے زمانے میں بھٹکنا ہی پڑا	67
-33	چاند کو چمک دے کر مجھ کو ڈوب جانا ہے	69
-34	سائلِ رحم و کرم پہ یہ نوازش کیسی	70
-35	رات ہے اماوَس کی اور چراغِ شب جاناں	71
-36	ہرے درختوں کی رنگت اڑی ہوئی کیوں ہے	72
-37	خود شناسی کا زہر گھولتی ہوں	74
-38	اس تفاوت کا مرے غافل کو اندازہ نہیں	75
-39	خواب بکتے نظر آنے لگے بازاروں میں	76

-40	گونگے، بہروں میں بھلا نطق وفصاحت کیسی	77
-41	نیند کا قحط ہے خوابوں کے شجر پیلے ہیں	78
-42	حدیثِ زیست کی تفسیر مجھ کو مل جائے	79
-43	چراغ سامنے جب بھی ہوا کے آیا ہے	80
-44	غم کا آنچل ڈھلک گیا ہوگا	81
-45	کمک نہ آئے گی تم انتظار مت کرنا	82
-46	شہر کوفہ تری تعریف میں کیا کیا لکھیں	83
-47	اپنے ہی گھر میں کوئی اس طرح مہمان نہ ہو	84
-48	کیا ہو تعریف لاجواب تھا وہ	86
-49	دل تمناؤں کا سوکھا ہوا جنگل کیوں ہے	87
-50	اسے یاد رکھنا محال تھا مجھے بھولنے پہ ملال تھا	88
-51	شہرِ خاموش کے مہمان کو جانے دیجے	89
-52	بُجھا بُجھا سا تھا وہ بھی، اُداس میں بھی تھی	91
-53	میں ہوں اک عبد اور تو معبود	93
-54	سب حقائق سے ماورا تھا وہ	95
-55	نگاہِ ناز جو بدلی جہاں بدلنے لگا	97
-56	سر کی قیمت کہاں باقی رہی دستار کے بعد	98
-57	کچھ اس طرح سے عشق کا سودا کیا گیا	100
-58	نکل تو آیا ہے سورج مگر سحر نہ لگے	101
-59	میں ہوں زمینِ محبت اور آسمان ہے وہ	102
-60	اے شہرِ انتشار مسرت کہاں گئی	103
-61	میرے چارہ گر تجھے کیا خبر جو عذابِ ہجر و وصال ہے	104
-62	زبان کھولو نہیں حرفِ مدعا کے لیے	105
-63	خواب رخصت ہوئے آنکھوں میں کھٹک باقی ہے	107

-64	شامِ وصال ڈھل گئی ہجر کی شب ہے خیمہ زن	109
-65	تاریخ لہو رو رہی ہے	110
-66	یا یقین دے یا گمان دے یا توقتل کر یا امان دے	111
-67	نظر کے پاس ہونا دل کی قربت ہو نہیں سکتی	112
-68	قاتل اماں نہ دے تو مجھے قتل گاہ میں	113
-69	موسمِ گُل میں پرندوں نے شجر چھوڑ دیا	114
-70	گھر کی چوکھٹ کو پار کرنا پڑا	115
-71	ساتھ اس نے نہ دیا میرا دعاؤں کی طرح	116
-72	عشق میں جاں سے گزرنا تو کوئی بات نہیں	117
-73	خواہشوں کی تتلیاں (نظم)	118
-74	بکھرے خواب	119
-75	گردِ سفر	120
-76	دشتِ غربت میں یادِ وطن آ گئی	121
-77	انا کی آگ	123
-78	روحِ اقبالؒ سے تجدیدِ وفا کرنا ہے	124
-79	کچا رنگ	129
-80	موسم کا رنگ	130
-81	لفظوں کے مسیحا	131
-82	منجمد فکر	132
-83	غزالاں تم تو واقف ہو	133
-84	یہ چراغ بجھ نہ جائے	134
-85	تنہائی	136
-86	دلِ وحشی	137
-87	سعیٔ ناکام	139

-88	خوبصورت افسانہ	140
-89	ہم کبھی آئینے کی زینت تھے	141
-90	تعبیر کی منتظر آنکھیں	142
-91	شجرِ بے سایہ	144
-92	میرے ننھے پودے	146
-93	مان گئے	148
-94	قائد کے حضور احساسِ ندامت	150
-95	ویران صنم خانہ	151
-96	مکالمہ	152
-97	شکستہ دل کی دعا	154
-98	انتقال کے بعد کے تاثرات	156

تماشا

-1	راز کا بزم میں چرچا کبھی ہونے نہ دیا	159
-2	ابھی دعویٰ محبت کا نہ کرنا	160
-3	چشمِ احساس سے ٹپکا ہوا آنسو میں ہوں	161
-4	آج پھر آنکھ میری بھر آئی	162
-5	اب خوشی میں کوئی خوشی نہ رہی	164
-6	پوری کوئی بھی تمنا نہیں ہونے دیتے	165
-7	جنوں ہی آگہی کی انتہا ہے	166
-8	چند تنکے ہی گلستان میں رہنے دیتے	167
-9	کل میں دعائے نیم شبی کر کے جب اُٹھی	168
-10	پتّے پتّے پر ہے شبنم	169
-11	مصحفِ سادہ کے مفہوم کی سورت وہ ہے	170

12-	زندگی جینے کا انداز نیا مانگے ہے	171
13-	جرم و انصاف عدالت کے لیے	172
14-	چراغِ فکر مری تیرگی نہیں جاتی	173
15-	سارے عالم میں انتخاب کیا	174
16-	اپنا ہونا بھی نہ ہونے کے برابر ٹھہرا	175
17-	ہر قدم پر ہو رہا ہے امتحانِ آرزو	176
18-	کیوں ترے کُن کا اثر ہو نہ سکا ہے مجھ پہ	177
19-	زخمِ تمنا کام کا نکلا	178
20-	مٹھی بھر خاک اور اک کتبہ	179
21-	راہِ عشق میں کام جو کوئی کر جاتی	180
22-	مرے اندر جو پھیلی روشنی ہے	181
23-	میں اُسے ایک فسانے کی طرح پڑھتی رہی	182
24-	آپ ہیں کتنے حیلہ جو صاحب	183
25-	ترقی کا سبب ہے خود شناسی	184
26-	خلا ہے مجھ میں، کچھ اندر نہیں ہے	185
27-	مصلحت کوشی کی زحمت پہ نہ مجبور کرے	186
28-	جنوں پیمائی بڑھتی جا رہی ہے	187
29-	تجلی تھی جلوہ تھا کہ نگاہوں کا امتحاں	188
30-	مصلحت کو مری پسپائی نہ سمجھا جائے	189
31-	جبینِ ناز ہے سجدوں سے روشن	190
32-	کلی کھلانے کو بادِ صبا ضروری ہے	191
33-	نظر حیران ہے کیا ہو رہا ہے	192
34-	کیا گلہ ہے وجود ہو کہ عدم	194
35-	چاک دل کے کبھی سلے ہوتے	195

-36	اک یقیں تھا، گماں میں نہ رہا	196
-37	مجھے عروج نہیں ہے اُسے زوال نہیں	197
-38	کچھ یقیں تو گماں میں رکھتے	198
-39	رات کٹنے کے لیے تازہ نشانی نہ رہی	199
-40	سوچا نہیں گیا، مجھے سمجھا نہیں گیا	200
-41	ہم وہ کردارِ محبت ہیں تمھیں کیا معلوم	201
-42	چشم ولب، ابرو و رخسار لیے پھرتے ہیں	202
-43	تشنہ لبی کو چہرے سے پہچانتے نہیں!!	203
-44	اس بار ہوا گُن کا اثر اور طرح کا	204
-45	تعیّن سرحدوں کا کون کرتا	205
-46	شامِ تنہائی نے یہ حشر اٹھایا کیوں تھا	206
-47	اب کوئی اور ہی پھل ہے جسے چکھنا ہے مجھے	207
-48	لٹ گئی ہے دکانِ وفا ان دنوں عشق کندن نہیں ہے مسِ خام ہے	208
-49	زندگی کے ملال میں گم ہیں	209
-50	ایک ہی لمحہ تو ہوتا ہے فیصلے کا	210
-51	مجھے دیکھو، سنو اور یاد رکھو	210
☆	قطعات	
-52	اپنی تہذیب کا نشان ہیں ہم	211
-53	اتنے لوگوں میں بھی میں ہوں میری تنہائی ہے	211
-54	ہوگا یوں جشنِ بہاراں ہمیں معلوم نہ تھا	212
-55	حسنِ خوبی سے نبھانا چاہتے ہو تم اگر	212
-56	چراغِ وصل کسی طور جل ہی جائے گا	212
-57	سارا جہان قبلہ و کعبہ کہے جنھیں	213
-58	خزاں نے شکل بدل ڈالی سارے باغوں کی	213

-59	ہمیں تقسیم کر دیتے ہیں ہم کو توڑ دیتے ہیں	213
-60	بدگماں فضاؤں میں عشق کی یہ صورت ہے	214
-61	خاک کو خاک کے بستر کے سوا کچھ نہ ملا	214
-62	سیاہ راتوں کو جب بے چینیوں میں کاٹ دیتے ہیں	214
-63	فسانے حرف ہوتے جا رہے ہیں	215
-64	کسی کی یاد کی شبنم سے جب وضو ہوگا	215
-65	دل میں دلکش سی ہوک اٹھتی ہے	215
-66	وہ یادِ ماضی کا ہر سلسلہ ہے تابندہ	216
-67	رہِ وفا میں کوئی ایسا واقعہ گزرے	216
-68	یوں ہی جینے کا یوں ہی مرنے کا	216
-69	وقتِ رخصت وہ آنکھ کے آنسو	217
-70	کلیسا، بت کدہ محراب و منبر	217
-71	ان کی تنقید مناسب نہیں ہوتی لوگو	217
-72	کھنڈر میں دل کے جنوں کے سراغ ملتے ہیں	218
-73	وہی قدیم حکایت وہی روش دل کی	218
-74	تلاشِ دوست میں لمحوں کو رائیگاں کر کے	218
-75	پھولوں سے محبت میں گلستان کی خاطر	219
-76	آسماں پر جو دھنک چھائے گی	219
-77	وضاحتوں سے تو دل صاف ہو نہیں سکتا	219
-78	یہ آج، میرے کل کی صفیں کاٹ رہا ہے	220
-79	سرحدِ دل کے تم نگراں تھے راہِ وفا پتھریلی تھی	220
-80	وقت ایسا ہے کہ دشمن بھی گلے ملتے ہیں	220
-81	ہر اک منزل پہ تازہ امتحاں ہے	221
-82	چشمِ حیراں میں بلائے ناگہانی درج ہے	221

83-	''زور'' لباسِ تقویٰ پہن کے آیا ہے	221
84-	افکارِ عمیق	222
85-	پرانے سکّے	223
86-	ویلنٹائن ڈے	224
87-	ریت کے بگولے	226
88-	کسبِ سخن	228
89-	بیوہ	229
90-	گونگی دیوی	231
91-	آدھی گواہی پوری سزا	232
92-	خانہ جنگی	233
93-	کربِ تخلیق	234
94-	زندگی ہے فنکاری	236
95-	اندھے گواہ	238
96-	گُرگ آشتی	239
97-	رسم کے قیدی	240
98-	راستے دل کے ہیں طے کرنا تو اے فرزانو!!	240
99-	ربطِ پیہم	241
100-	صرف بچایا اک مقصد کی خاطر اور	241
101-	شجرۂ نسب	242
102-	صفحۂ قرطاس	243
103-	شاعری کا ماہِ تمام	244
104-	قصرِ ابیض فکرِ اسود	245
105-	یہ آواز کس کی ہے	249

ردائے ہجر

-1	ہماری قربتوں میں فاصلہ نہ رہ جائے	253
-2	دشتِ دل میں کبھی اک ناقہ سوار آیا تھا	254
-3	تمام عمرِ رواں کا مآل حیرت ہے	255
-4	میں راکھ ہونے کو ہوں تُو مری چمک پہ نہ جا	256
-5	جو بھی گیا وہ خاک بسر رائیگاں گیا	257
-6	طلوعِ ہجر ہوا، اور وصال ڈوب گیا	258
-7	ہوئے ہو کس لیے برہم عزیزم	259
-8	عجیب ہی سفر تھا اپنی ذات کی تلاش کا	260
-9	کاوشِ روزگار نے عمرِ رواں کو کھالیا	261
-10	میں ارتکازِ تمنا سے اب گریزاں ہوں	262
-11	بڑے تپاک سے بھیجا سلام وحشت نے	263
-12	اس سے پہلے کہ ترا دشت مجھے راس آ جائے	264
-13	مریضِ عشق کا بہت عجیب حال ہو گیا	265
-14	گفتگو ہوتی رہی، ہوتی رہی، ہوتی رہی	266
-15	فریبِ عمرِ گزشتہ کہاں لکھا جائے	267
-16	میں اک خرابۂ کردار میں سِسک رہی تھی	268
-17	دن کا راجا ہوتا ہے اور رات کی رانی ہوتی ہے	269
-18	میں صرف ہو رہی ہوں ضرورت کے واسطے	270
-19	ہم سے آشفتہ مزاجوں کا پتا پوچھتی ہے	271
-20	عجیب خواب تھا پھر اس کے بعد سو نہ سکی	272
-21	زندگی نے پھرایا ادھر سے ادھر طے کیے کتنے دیوار و در دوستو!	273
-22	جو آ رہا ہے نظر وہ اگر نہ ہو، کیا ہو؟	274

-23	عشق وہ چشمۂ بے فیض ہے جس سے اکثر	275
-24	بجز سکوت نہیں پاس کچھ سخن کے لیے	276
-25	ہم پیاس کو اپنی پی رہے ہیں	277
-26	سکوتِ عصر میں گونجی ہوئی اذان ہوں میں	278
-27	میں وہ زلیخا تھی جس نے کبھی بھی یوسف پر	279
-28	آج کی رات چراغوں کو بجھا رہنے دے	280
-29	زندگی روز طلب کرتی ہے مجھ سے مجھ کو	281
-30	ذرا سی دیر طبیعت بحال رہنے دے	282
-31	زندگی کس ڈگر پر اٹھا لائی ہے مائے نی	284
-32	ہجر کا پلّو اڑتا جائے یادوں کی پروائی سے	286
-33	بے طلب کر کے ضرورت بھی چلی جائے اگر	288
-34	یہی بُجھا ہوا لہجہ گواہ ہے میرا	289
-35	جیسے خوشبو کو سلیقے سے صبا لے جائے	290
-36	چاک دامانِ تمنا کے بکھرنے نہ دیے	291
-37	زادِ سفر سمیٹئے، خیمہ جاں اُٹھایئے	292
-38	کارواں ہائے تمنا تو نہیں ٹھہریں گے	293
-39	حبس جب حد سے بڑھا جسم کے ویرانے میں	294
-40	کتنے پُر ماجرا تھے روز و شب	295
-41	عروسِ ہجر ترا انتظام ہونے کو ہے	296
-42	ایک اک گام پہ اپنے کو سنبھالے ہوئے میں	297
-43	تری نگاہ کا لہجہ خیال میں آ کر	297
-44	وہ عہدِ خواب کی تجدید کرنے لگتا تھا	298
-45	وحشت رفتہ رفتہ مجھ میں خاک اڑا کے بیٹھی ہے	299
-46	خیمے لگتے ہیں اور اکھڑتے ہیں	300

-47	شور اندر جو ہے برپا وہ صدا ہو نہ سکا	301
-48	مرا وجود بھی میرا وجود ہے کہ نہیں	302
-49	یہاں جو رہتا تھا پہلے وہ کیا چلا گیا ہے؟	303
-50	اوقات سے باہر نہیں ہونے دیا خود کو	304
-51	مجھ کو خود میں قیام کرنا تھا	304
-52	دشمنِ جاں نے مری ایسی نگہ داری کی	305
-53	تو نے اے موجِ ہوا! کیسا مٹایا اس کو	306
-54	وہ دکانِ طلب کو سجاتے رہے اور تمنا کا بازار ہم بن گئے	307
-55	اک درِدِ آگہی تھا بہت دیر تک رہا	308
-56	سارے رشتے تھے آزمائے گئے	309
-57	ایک کردار کہانی کے حوالے کر کے	310
-58	ہماری تابِ پر و بال ناپنے والے	311
-59	کسی سے بھی مری وحشت سنبھل نہیں پائی	312
-60	اب تو مرے افکار کو دے اذنِ تکلّم	313
-61	ہوائے شام چلے تو بکھرنے لگتی ہوں	314
-62	سگانِ کوچہ بہت شور کرنے لگ گئے تھے	315
-63	عجیب طور سے وہ آزمانا چاہتا ہے	316
-64	بے گھری رہتی ہے یا دربدری رہتی ہے	318
-65	دیے کی لَو نے لرزتے ہوئے کہا مجھ سے	319
-66	صبح بے نور ہے، شام بے کیف ہے، کیسی حالت میں ہے مبتلا زندگی	320
-67	زخم سہنے کی مشقت سے بہت تھک گئی تھی	321
-68	تمھارے حُسنِ تغافل سے کچھ گلہ بھی نہیں	322
-69	کیوں خاک اڑ رہی ہے تری کارگاہ میں	323
-70	چشمِ ادراک کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ اب	323

-71	لوگ بازار میں پھرتے ہیں ضرورت کے بغیر (عرفان صدیقی کی نذر)	324
-72	ایک شمع جلی اور جل کر بجھی	325
-73	کس سہولت سے ان کہی، کہی ہے	326
-74	خود فراموشی آبلہ پائی	327
-75	وہ نیند تھی کہ نہ کوئی اذان سے اٹھا	328
-76	فصلِ خواہش ہے محوِ بدن ان دنوں	329
-77	سارا عالم تری خلوت میں گنوا بیٹھے ہیں	330
-78	بہت دنوں رہا خود سے مکالمہ میرا	331
-79	بدگمانی کے جزیرے سے نکالے مجھ کو	332
-80	بابِ انصاف پر آنکھ پتھرا گئی	333
-81	اپنی آشفتہ مزاجی کو اٹھا لے گئے ہیں	334
-82	اس آئنے سے نکل اور خود کو تنہا کر	335
-83	ہست و موجود کبھی بے خبری ایسی ہو	336
-84	آئنہ رقص میں، تصویر مری رقص میں ہے	337
-85	ہمیں لکھا بھی اگر حاشیے میں رکھا گیا	338
-86	درد ہوا نہیں طلوع زخم چمک نہیں سکا	339
-87	بات جواب تلک نہ کی اس کو کبھی ذرا سمجھ	340
-88	ہمارا رنگِ خد و خال پوچھنے والے	341
-89	ہمیں جو کچھ دکھایا جا رہا ہے	342
-90	میں اپنے آپ سے وعدہ وفا نہ کر پائی	343
-91	کسی نے پوچھا جو عمرِ رواں کے بارے میں	344
-92	ہم خاک نشیں لوگ ہیں منصب سے نہ پہچان	345
-93	قرار سے مجھے رکھتی ہے بے کلی میری	346
-94	ہائے مغرورِ طرب تجھ کو خبر کیسے کریں	347

95-	جہاں پر خاک اڑتی ہے وہیں پر	347
96-	تمثیلِ وفا کی یہاں شہرت تو نہیں ہے	348
97-	اب طاق پر سجاؤ قناعت سنبھال کے	350
98-	آیتِ ہجر اترتی رہی دل پر میرے	351
99-	کیسا ہے رمزِ آگہی ایک بھی در نہیں کُھلا	352
100-	ذرا تم طاق پر رکھے محبت کے دِیے کو پھر جلاؤ	353
101-	گردشِ وقت	355
102-	مجھ کو ہونے کی نہ ہونے کی خلش ہے کیسی	357
103-	عالمِ عجلت	359
104-	نور کا بوسہ	361
105-	وقت کا شیلف	363
106-	گریۂ تحیّر	364
107-	سفرِ رائیگاں	365
108-	کلینکل ڈیتھ ہو چکی ہے!	366
109-	سعی	367
110-	ادھوری تصویر	368
111-	ایک نظم صرف تمھارے لیے	369
112-	عوام	371
113-	تہذیبِ نفس	373
114-	Mercy Killing	374
115-	الٹی بستی	375
116-	من کہ جویای خودی از بےخودی	377
117-	دسمبر	379
118-	میں نائیں سب تو	381

119- فون نمبر(۰۵۰۶۱۴۰۹۶۸) 382

120- بین الاقوامی منظر نامہ 384

121- نقشِ قدم 385

122- مکرو ریا کے سکّے 386

123- ''میں نے تجھے پہچانا ارادوں کے ٹوٹنے اور نیّتوں کے بدل جانے سے'' 387

124- کچا رنگ 389

125- فشارِ آگہی 390

126- بکاؤ مال 392

127- حرکتِ معکوس 394

128- رقصِ فسوں 395

ارتکاز

1- اپنے دامن سے کانٹے تمنا کے جھاڑے اور اپنے میں گوشہ نشیں ہو گئے 399

2- سارے ہی زخم بے رفو، سارا بدن لہو لہو (نذرِ غزہ و فلسطین) 400

3- آئینہ خانہ بن گیا ہے گھر کا گھر تمام 401

4- خلوصِ دیدۂ پُرنم تلاشتے رہیں گے 403

5- براہِ دشتِ خرد دل کہیں بھٹکتا ہے 405

6- سازِ دل، نغمۂ جاں، شور و فغاں ختم ہوا 406

7- لفظ جب عشق کی تمثیل میں تحریر ہوئے 408

8- زندگی تجھ کو ہے معلوم، کہاں رہتے تھے 409

9- اکیلے پن کی اذیت چھپائی جا رہی ہے 411

10- ایک ایک لفظ سے زنجیر کی جھنکار اُٹھے 413

11- بقدرِ صورتِ حالات راستہ نکلے 415

12- نبود و بود تمنائے لامکاں کے سوا 417

-13	چراغوں کا دھواں ہونے لگے ہیں	418
-14	رموزِ خاک نے تشہیر اک اداسی کی	420
-15	آرزوؤں کو رونا پڑتا ہے	421
-16	شمعِ ہستی نے آواز دی زندگی! (کرونا کے موسم میں)	422
-17	کبھی خدا کبھی خلقِ خدا کو ڈھونڈا کیے (کرونا کی وبا کے زمانے کی)	424
-18	لفظ جب اپنے معانی سے بچھڑ جاتے ہیں	426
-19	وصال لمحے کا زخم دل پر لگا ہوا ہے	427
-20	نیزوں سے تعبیروں کے سر لے جاؤ	428
-21	ایک سناٹا سا تقریر میں رکھا گیا تھا	430
-22	عدل کے نام پہ دریوزہ گری بڑھ رہی ہے	432
-23	اے خاک بتا گوہرِ نایاب کہاں ہیں	433
-24	اندھیری رات ہے روشن ستارے کھو رہے ہیں	434
-25	صورتِ شوخیِ بیباک سنبھالے ہوئے ہیں	435
-26	لامکاں کو کسی امکان میں لاتی ہوئی میں	437
-27	چل اپنی راہ لے اِس بددماغ سے نہ الجھ	439
-28	اتنی دریائے تمنا میں ہے ہلچل مرے دوست	440
-29	چشمِ وحشت میں تب و تاب نہیں دیکھیں گے	441
-30	ہوائے دردسرِ شام گفتگو کرے ہے	443
-31	بالیدگیِ شوق کے اسباب لے گیا (میؔر صاحب کی نذر)	445
-32	سمندر بِک گیا لہروں کا سودا ہو گیا ہے	446
-33	موسمِ گل مرے احساس پہ چھایا ہی نہیں	447
-34	دل خرابے میں یاس ہو گئی ہوں	448
-35	لالہ و گُل میں اُترنے لگا پُروائی کا رنگ	450
-36	رائیگانی کی عجب شکل دکھائی گئی ہے	452

-37	بقدرِ حُسن کہانی میں گونجتا ہے بہت	453
-38	تغارچے سے جومٹی اڑائی جارہی ہے	454
-39	قلم سے زخم کو کرنا پڑا رفو سائیں	455
-40	چراغِ تشنگیِ دل نہیں ہے داغ سے خوف	457
-41	عشق جب سُبحہ و تہلیل سے باہر آئے	458
-42	بابِ ساعت	459
-43	آنکھوں کی ایش ٹرے میں	461
-44	خوفناک حُسن Terrible Beauty	463
-45	ادھوری نظم	466
-46	''ہاں دوست ایسا ہی تھا''	467
-47	نور کی خوشبو	470
-48	انصاف کا ہیرا تو کیسا انمول ہے (نظم)	472
-49	رات کچھ بچھڑے ہوئے خوابوں سے پیمان ہوئے (نظم)	473
-50	عصرِ حاضر کی قتل گاہ	475
-51	Trick or Treat	477
-52	تم کو زندہ رہنا ہے	481
-53	نومبر ۲۰۲۳ء	483
-54	چلو تسنیم بیگم	484
-55	حنوط خواب	485
-56	زمستانی ہوا	486
-57	آواز کا دم گھٹ رہا ہے	487
-58	یومِ تشکر Thanks Giving	488
-59	یہ دنیا یہ حقیر و بے وقعت دنیا	491
-60	تم کب آؤ گے	493

-61	اب اماوس کی اس رات میں (نظم)		495
-62	رنگوں کی دنیا		493
-63	آنکھیں تم کو ڈھونڈیں ہیں رنگریز مرے		499
-64	سنا ہے!!		501
-65	کجا ہستی		503
-66	ابد اور ازل کے نوری تماشے میں (نظم)		505
☆	منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی	تسنیم عابدی	506
☆	بکھرے خوابوں کی شاعرہ	پروفیسر آفاق صدیقی	510
☆	چند تاثرات	پروفیسر سحر انصاری	515
☆	تسنیم عابدی کی شاعری	علی حیدر ملک	518
☆	ایک کی تلاش	تسنیم عابدی	522
☆	ایک خود شناس شاعرہ... تسنیم عابدی	ڈاکٹر سلیم اختر	524
☆	تسنیم عابدی کی شاعری کے رنگ	ڈاکٹر عبدالکریم خالد	528
☆	تسنیم عابدی کی شاعری میں حزنیہ عناصر	ڈاکٹر شبیہ الحسن	531
☆	تسنیم عابدی......جدید لہجے کی شاعرہ	ڈاکٹر سیّد نواز حسن زیدی	546
☆	پیش لفظ	تسنیم عابدی	551
☆	خیر مقدم	خورشید رضوی	553
☆	''ردائے ہجر''— مکمل شخصیہ	نصیر ترابی	555
☆	حیات آشنا شاعرہ — تسنیم عابدی	خواجہ رضی حیدر	557
☆	ردائے ہجر میں لپٹا پُر ملال لہجہ	شاہدہ حسن	565
☆	عورت ہونے کے ناتے	ڈاکٹر صلاح الدین درویش	569
☆	تسنیم عابدی کی شاعری	فاطمہ حسن	574

آگہی کا تماشا

عمر کی شام قریب ہے۔اسی لیے عجلت میں خود کو سمیٹنا بہت ضروری ہے۔تمام زندگی تلاش کا سفر جاری رہا۔اس سفر میں لفظ نے سہارا دیا اگر یہ نہ ہوتے تو کیا ہوتا یہ سوال اکثر میں اپنے آپ سے کرتی رہی!؟ وقت کے سمندر میں ہاتھ پاؤں مارنے سے بس یہ تسلّی ہی ہوتی ہے کہ ڈوبنے والے نے خود کو موجوں کے حوالے نہیں کیا وہ حتی الامکان متحرک رہا۔اس سفر کی روداد میں گاہے بگاہے اپنے شعری مجموعے میں لکھتی رہی اور اب کلیات کی صورت میں سامنے ہے۔دراصل وجود کے دروازے پر دستک سن کر وہ دروازہ وا کرنا پڑتا ہے جو اندر کی جانب کھلتا ہے پھر ایک در کے بعد دوسرا در اور پھر تیسرا در۔۔آئینہ خانہ میں خود سے سوال کرتے لمحے امکانات کی ایک دنیا آباد کرتے ہیں۔روز کبھی خود کو دریافت کیا جاتا ہے اور کبھی دنیا سے شناسائی ہوتی ہے۔میں کون ہوں اور کیوں ہوں؟ ہوں یا نہیں ہوں؟ کون اور کیوں کے غار سے کُن کی چند کرنیں ہاتھ آتی ہیں تو لفظ اپنی چھب دکھانے لگتے ہیں۔پہلے مجموعے سے کلیات تک کا سفر میری عمر بھر کی پونجی ہے۔ہم جس عہد سے وابستہ ہیں وہ تہذیب کے برزخ کا زمانہ تھا۔ثقافت کی مہک ہماری زندگی میں رچی بسی تھی۔کراچی جسے روشنیوں کا شہر کہا جاتا تھا اس کی گلیوں اور چھوٹے سے پیر کالونی کے مکان میں سانسیں لیتے ہوئے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ کراچی ہمارے لیے میؔر و غالبؔ کی دلّی یا جونؔ ایلیا کا امروہہ بن جائے گا!!''اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو'' پھر وقت نے ثابت کیا ہجرت کے لیے فاصلے کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی!! ہجرت تو اپنی تہذیب اپنی ثقافت اپنی زبان سے دوری کا نام ہے اسی لیے اس عالمی گاؤں (گلوبل ویلج) میں اب سرمایہ دارانہ نظام نے سب کو مہاجر بنا دیا۔ ہر تہذیب مٹ رہی ہے۔بڑی بڑی عمارتیں فطرت کے حسن کے مقابل آچکی ہیں، تعلیم کا مقصد پیشہ ورانہ ہنر مند پیدا کرنا ہوگیا ہے۔اب فلسفہ، ادب فنونِ لطیفہ بے مقصد اور بیکار چیزیں

ہو گئیں۔ اگر شاہنامہ لکھنے والے آج لکھتے تو شاہنامۂ انسان لکھتے!! آج اس پُرآشوب دور میں بھی اہلِ قلم لکھ رہے ہیں کیونکہ کارپوریٹ مارکٹنگ میں ہمارے پاس ہندسے نہیں بس لفظ ہیں۔ لفظ جو وقت کی طرح رمز رکھتے ہیں اپنے لکھاری سے ہمدرد ہوتے ہیں مجھے الفاظ کی حرمت کا احساس ہے اسی لیے میرے لفظ صرف قلم کی نوک سے نہیں بلکہ دل کی روشنائی سے صفحہ پر منتقل ہوتے ہیں۔ مجھے آگہی کی اہمیت کا اندازہ ہے اسی لیے میں جنتِ گم گشتہ کی تمنا کرتے ہوئے اپنی جنت زمینِ آگہی پر تعمیر کرتی رہی۔ کہی اور ان کہی کے درمیان میرا قاری مجھے تلاش کر لے تو میرا سفر رائیگانی سے بچ جائے آخر میں ان دوستوں کا شکریہ جو آگہی کے سفر میں مجھے توانائی دیتے رہے۔ کلیات کے نام کے سلسلے میں عدیل زیدی اور انیق احمد کے مشورے کا شکریہ۔ نسیم سید اور فاطمہ حسن نے اپنی قیمتی رائے سے مجھے آسودگی بخشی، میں دل کی گہرائیوں سے ان کی احسان مند ہوں۔ وہ جو مجھے چھوڑ کر چلا گیا جس کے وصل نے مجھے جینا سکھایا اور جس کے فراق نے مجھ کو عاشق بنا دیا۔ اختر عابدی تم دور ہو کر اور بھی قریب آ گئے۔ اپنے پیارے بچوں کا شکریہ جو میری وحشتوں کو برداشت کرتے ہیں۔

تسنیم عابدی

28-اکتوبر 2024ء

صحرا آنکھیں اور تنہائی

انتساب

اپنے والدین کے نام
اور
سلیم جعفری کی ادب نوازی کے نام

جب پلٹ آئے تو اس سے واسطہ رکھا نہیں
شہرِ دل کا کوئی دروازہ کُھلا رکھا نہیں

وہ ہوا کی طرح ہے میرا مخالف اس لیے
سامنے اس شخص کے اپنا دِیا رکھا نہیں

دیکھ لینا وہ اچانک ہی جُدا ہو جائے گا
دوستی میں اس نے کیونکہ فاصلہ رکھا نہیں

کس طرح تقسیم ہوتے جارہے ہیں عشق میں
خرچ ہو جائیں نہ ہم خود کو بچا رکھا نہیں

دور اور نزدیک کا ہے فلسفہ پیچیدہ سا
سب سے رہ کر بھی الگ خود کو جدا رکھا نہیں

وسعتیں صحراؤں کی حق میں گواہی دیں مرے
سر میں کب میں نے نیا سودا اُٹھا رکھا نہیں

اک گھروندا تھا وہ بکھرا کیسے
خواب تعبیر سے بچھڑا کیسے

آنسوؤں نے کیا رسوا کیسے
رازِ دل ہو گیا افشا کیسے

جانے کس کرب سے گزرا ہو گا
اپنے ہی قول سے مکرا کیسے

نہ سحر آئی نہ ہی بادِ صبا
پھول پھر شاخ پہ کھلتا کیسے

اس کے وعدے پہ یقیں تھا لیکن
دل تو پھر دل تھا سنبھلتا کیسے

گیسوئے زیست بہت الجھے ہیں
زلف کا پیچ ہو سیدھا کیسے

تم زیست گزاری کا ہنر بھول نہ جانا
آ جائے سفر راس تو گھر بھول نہ جانا

اے چارہ گرو! درد کے بڑھنے کی دوا دو
اے بے خبرو! میری خبر بھول نہ جانا

کب سے یہ اماوس کی سیہ رات ہے سر پر
اے چاند میری راہ گزر بھول نہ جانا

ہونے لگے رخصت تو یہ برگد نے کہا تھا
یہ چھاؤں یہ ٹھنڈک یہ شجر بھول نہ جانا

جس پھول سے ہے باغ کی زینت میں اضافہ
اے بادِ صبا وہ گلِ تر بھول نہ جانا

دی خانہ بدوشی نے مجھے کہہ کے تسلی
ہے زیست کا مقصد ہی سفر بھول نہ جانا

کیا وقت ہے ساقی کہیں ، میخانہ کہیں اور
صحرا ہے کہیں اور تو دیوانہ کہیں اور

اے اہلِ خرد! اہلِ جنوں پوچھ رہے ہیں
کیا کعبہ کہیں اور ہے بت خانہ کہیں اور

میں تجھ سے جدا ہو کے مکمل تو نہیں ہوں
شمع جو کہیں اور ہے پروانہ کہیں اور

جو کل بھی تھے محروم وہ ہیں آج بھی محروم
تاثیرِ دعا دیکھی ہے روزانہ کہیں اور

اس خواب کی تعبیر سے تو خواب بھلا تھا
ہے جام کہیں اور تو پیمانہ کہیں اور

اک بابِ آگہی جو کبھی مجھ پہ وا ہوا
بس وحشتوں کا حق میں مرے فیصلہ ہوا

میں زیست کی بساط پہ شہ مات کھا گئی
بازی کے ہارنے میں بڑا فائدہ ہوا

تحلیلِ غم نفوذِ محبت کے واسطے
اپنی تلاش بھی تو عجب مرحلہ ہوا

کچھ چاندنی اداس تھی کچھ دل بھی تھا اداس
کل رات کربِ ذات بھی حد سے سِوا ہوا

ہونٹوں پہ حرفِ حق میں سجائے کھڑی رہی
ان پتھروں میں کون مگر ہم نوا ہوا

اب اور نہ یوں تیرگئ دل کو بڑھاؤ
زندانِ وفا میں کوئی دیپک ہی جلاؤ

پہلے تو سرِ کوئے ملامت میں پھراؤ
پھر کاسئہ سر کاٹ کے نیزے پہ چڑھاؤ

شاید مرے حصے میں مسافت ہی لکھی ہے
اب شوقِ جنوں کو نئی منزل نہ دکھاؤ

ہم کاسئہ دل لے کے صدا دیتے رہیں گے
تم تنگیِ داماں کا نہ الزام لگاؤ

آنکھوں کی زبانی ہی عیاں ہونے لگا ہے
تم کچھ نہ کہو لاکھ حقیقت کو چھپاؤ

دانائی کو بینائی کا احساس دلانے
تم چاہ سے یوسف کو ذرا ڈھونڈ کے لاؤ

دل کے دِیے جلے تو دھواں ہو کے رہ گئے
ہم رفتہ رفتہ ریگِ رواں ہو کے رہ گئے

موسم کی تلخیوں نے حلاوت ہی چھین لی
ہم ایسے لوگ تلخ زباں ہو کے رہ گئے

افسانۂ حیات کا عنوان ہم ہی تھے
اور آج ہم ہی ردِّ بیاں ہو کے رہ گئے

یہ انقلابِ دہر نہیں تو بھلا ہے کیا
کانٹے چمن کے روحِ رواں ہو کے رہ گئے

موتی کی طرح عمر کے دن یوں بکھر گئے
بازارِ زندگی میں زیاں ہو کے رہ گئے

زندگی کے باب حرفِ مختصر ہونے لگے
شب کی تاریکی میں سائے معتبر ہونے لگے

کس ریاضت سے نشیمن تھا بنا اور کس طرح
ایک ہی جھونکے سے تنکے منتشر ہونے لگے

بے حسی کا رنگ ہر دیوار و در پہ چڑھ گیا
خون کے آنسو بھی اب تو بے اثر ہونے لگے

لوٹ جانے کی تمنا دل ہی دل میں رہ گئی
راستے خود اپنے گھر کے پُرخطر ہونے لگے

وقت نے کچھ اس طرح مصروف کر ڈالا ہمیں
اپنے گھر والوں ہی سے ہم بے خبر ہونے لگے

کچھ طبیعت مضمحل کچھ آنکھ بھی حیران ہے
ڈھیر پروانوں کا ہے اور خالی شمع دان ہے

کچھ سیاست وقت کی کچھ مصلحت ہے ورنہ دوست
فرق رہبر اور رہزن کا بہت آسان ہے

جس کی بنیادوں میں شامل تھا ہمارا خونِ دل
ہاں وہی گھر اب ہمارے واسطے زندان ہے

ظلم کی حد سے گزر جانے کو کہتے ہیں یزید
انتہائے صبر تو شبیرؑ کی پہچان ہے

رتجگوں کا کرب ، دن بھر کی تھکن اور انتظار
آج آنکھوں میں ہمارے حشر کا سامان ہے

نا خداؤ تم ہی بتلاؤ کہ کیا گزری بھلا
روشنی کا شہر آخر کس لیے ویران ہے

''مصر کے بازار کی غربت زدہ اک پیر زن''*
آج بھی وہ عشق کا اِک دل نشیں عنوان ہے

* علامہ طالب جوہری

عجیب میں ہوں عجب ہی مرا فسانہ ہے
قدم قدم پہ مجھے خود کو آزمانا ہے

رقیب میرے ہیں اپنے تو کس طرح بچتی
کہ آستین کے سانپوں سے ہار جانا ہے

ہتھیلیوں سے میں کب تک بچاؤں گی آخر
چراغ لے کے ہواؤں کو آزمانا ہے

دعا نہ مانگیں گے جو دسترس سے باہر ہو
ہمیں عقیدے کو اپنے نہیں گنوانا ہے

خدا کرے مری ہمت نہ ہو شکستہ کبھی
مزاجِ شہر تو لوگوں کا دل دکھانا ہے

سکوت میں بھی تھا انداز گفتگو جیسا
وہ مہربان بہت تھا مگر عدو جیسا

صبا کی طرح وہ آیا تو کھِل اُٹھی میں بھی
وہ لمحہ عشق میں تھا لمحۂ نمو جیسا

وہ چارہ گر تھا ہنر اس کے ہاتھ میں تھا بہت
کہ اس کا طرزِ تخاطب ہی تھا رفو جیسا

دعا تھی لالہ و گُل سے سجے مری مٹی
تو پھر زمین کا ہے رنگ کیوں لہو جیسا

سمندروں کی طرح ایک ہی روش پہ بہو
طریقہ تم نہیں اپنانا آب جُو جیسا

نگاہِ شوق نے تشنہ لبی بڑھا دی تھی
سراب راہ میں تھا حرفِ آرزو جیسا

بے سود ہے وجود نہ ہستی نہ بُود ہے
اے شمعِ سوختہ تیرا انجام دُود ہے

سوداگری کا شوق ہے پر جانتے ہیں یہ
اس پیشہِ وفا میں زیاں ہے نہ سُود ہے

صحرائے زندگی کا سفر سخت ہے مگر
اک حوصلہ ہے اور یہ میرا وجود ہے

احساس برف برف ہے جذبات سرد سرد
اے آہوانِ عشق یہ کیسا جمود ہے

رستے کے خار پھول بنے کہکشاں بچھی
اور اس کے بعد سامنے چشمِ حسود ہے

اپنے بیمار سے یہ بے خبری کیسی ہے
گھر کے ہوتے ہوئے بھی در بدری کیسی ہے

لوگ کہتے ہیں دعاؤں میں اثر ہوتا ہے
پھر دعاؤں میں مری بے اثری کیسی ہے

ہم بھی تو دید کے شائق ہیں تجھے ڈھونڈتے ہیں
طور پر چپکے سے یہ جلوہ گری کیسی ہے

صحنِ احساس میں رہتی ہے کہاں ایک سی رُت
دل کے زخموں کی یہ پھر شاخ ہری کیسی ہے

جس نے خورشیدِ محبت کا سنایا ہے پیام
دیکھ لو طاق پہ شمعِ سحری کیسی ہے

وقت نے گم کیے سب عہدِ گزشتہ کے عذاب
پھر مرے ذہن میں اِک یاد دھری کیسی ہے

کاش تم گھر کو بنانے کا ارادہ کرتے
گر ارادہ نہیں کرتے کوئی وعدہ کرتے

میری مضمون نگاری کے ہو عنواں تم ہی
اپنی تحریر کو اب اور کیا سادہ کرتے

مے کشو بادہ کشی خود کو گوارا بھی نہ تھی
ورنہ ان آنکھوں کو ہم ساغر و بادہ کرتے

بس گزر گاہوں سے ہی پوچھ لو تنہائی کا
کارواں میں بھی سفر ہم تو فرادہ کرتے

پیکرِ گل کی طرح ہم ہیں بکھرنے والے
کاش تم عہدِ وفا کا نہ اعادہ کرتے

راہبر عزمِ سفر دل میں کہاں ہے باقی
ورنہ بے رختِ سفر خواہشِ جادہ کرتے

❁

ہم جو اک حرف تھے سو ادا ہو گئے
ایسے بکھرے کہ رزقِ ہوا ہو گئے

ظلم اور سانحے عام اتنے ہوئے
شہر کے شہر ہی کربلا ہو گئے

خیمۂ دل کی جلتی طنابیں بجھیں
دارِ ہستی پہ جب ہم ادا ہو گئے

شاخ پر پھول سے ایسی زینت کہاں
میرے بالوں میں گُل خوش نما ہو گئے

دکھ میں لذت سی محسوس ہونے لگی
زخم شاید مِرے لا دوا ہو گئے

شور میں اک روز گُم میری صدا ہو جائے گی
زندگی کے ساز کی قیمت ادا ہو جائے گی

ہر طرف سے نفسا نفسی کا اٹھے گا شور پھر
حشر سے پہلے ہی محشر کی فضا ہو جائے گی

کوچۂ قاتل سے ہم مانوس ہوتے جائیں گے
اس گلی کی گرد زخموں کی دوا ہو جائے گی

رتجگوں سے رفتہ رفتہ آشنا ہو جائیں گے
شب کی تنہائی طبیعت آشنا ہو جائے گی

شمع بھی بجھ جائے گی اور پھول بھی مرجھائیں گے
کیا خبر تھی زندگی میری سزا ہو جائے گی

ہر شجر محروم ہو جائے گا برگ و بار سے
گلشنِ ہستی میں پت جھڑ کی فضا ہو جائے گی

اُداس لوگوں کو تم لوگ کیا ستاؤ گے
جو بجھ گئے ہیں دِیے ان کو کیا بجھاؤ گے

ریا کے جال میں تم ایسے آتے جاؤ گے
کہ آپ اپنے کو پہچان بھی نہ پاؤ گے

چراغِ مہر و محبت سے جو ہوئے محروم
تم ہی مزار پہ ان کے دِیے جلاؤ گے

میں اپنے خوابوں کی دنیا میں ہوں مگن لوگو!
مجھے اجاڑ کے تم لوگ کچھ نہ پاؤ گے

خدا سے ربط میں ہے آپ کی ضرورت کیا
فقیہِ شہر کو یہ کس طرح بتاؤ گے

پھول مرجھا جائیں گے کانٹے لگے رہ جائیں گے
ہر خوشی مٹ جائے گی بس دکھ ہرے رہ جائیں گے

لالہ زاروں کوہساروں میں تمھیں ڈھونڈیں گے ہم
یاد کے بے نام سے کچھ سلسلے رہ جائیں گے

تم قریب ہو کر بھی اتنی دور ہوتے جاؤ گے
قربتوں کے درمیاں بس فاصلے رہ جائیں گے

تصفیہ مابین اپنے ہو نہ پائے گا کبھی
ہم انا کی آگ میں جلتے ہوئے رہ جائیں گے

عزم کی شمعیں امیدوں کی ہر اِک قندیل کو
ہم بجھا کر ظلمتِ شب میں کھڑے رہ جائیں گے

سرمہ و غازہ کے بدلے دھول جمتی جائے گی
گردِ قسمت سے سبھی چہرے اَٹے رہ جائیں گے

سب چلے جائیں گے اک بے نام منزل کی طرف
گھر کی تختی کی جگہ کتبے لگے رہ جائیں گے

اشکوں کو چھپاتے ہیں سجایا نہیں کرتے
ہم درد کی دولت کو دکھایا نہیں کرتے

ایثار و محبت تری تسلیم ہے لیکن
احسان کو اے دوست جتایا نہیں کرتے

دکھ درد کے کانٹے ہیں کوئی پھول نہ پتہ
وہ پیڑ لگائے ہیں جو چھایا نہیں کرتے

بستی کا ہر اک شخص مسیحا تو نہیں ہے
ہر اِک کو حال اپنا سنایا نہیں کرتے

عورت کا تقدس ہے فقط شرم و حیا سے
ہم بزم کو عورت سے سجایا نہیں کرتے

تسلیم و رضا کا وہی بنتے ہیں نمونہ
سجدے میں جھکے سر جو اٹھایا نہیں کرتے

سنتے ہیں وہاں دیر ہے اندھیر نہیں ہے
ہم دستِ دعا یونہی اٹھایا نہیں کرتے

تمھیں تھا زعمِ مسیحائی گھاؤ دیکھ لیا !
ہمارے درد کا دل سے لگاؤ دیکھ لیا

چمن ہمارا تھا اوروں نے پھول بانٹ لیے
ہمارے عشق کا یہ رکھ رکھاؤ دیکھ لیا

ہم اب کی بار بھی ناکام و نامراد رہے
شکست و ریخت کا سارا جھکاؤ دیکھ لیا

مہک رہے ہیں محبت کے پھول محفل میں
تم اپنا زخمِ جگر مت چھپاؤ دیکھ لیا

تمام شہر سے شعلے بلند ہونے لگے
علاجِ تیرگیِ شب بتاؤ دیکھ لیا

دل کھِنچا جاتا ہے اس کی طرف ایسا کیا ہے
وہ جو اِک شخص نہیں بزم میں رکھا کیا ہے

رات کس آس پہ ہم کاٹ دیں یہ سوچتے ہیں
سحر آئے گی مگر اپنا بھروسہ کیا ہے

ابتدا گل سے تو انجام ہوا کانٹوں پر
عقل حیران ہے یہ عشق کا رستہ کیا ہے

سر جھکائے ہوئے وہ دار تلک جا پہنچا
جو کہا کرتا تھا سچ کہنے میں دھڑکا کیا ہے

وحشتیں بڑھتی چلی جاتی ہیں رفتہ رفتہ
شہرِ دل پر کسی آسیب کا سایا کیا ہے

ہار کر بھی میں کھڑی تھی کسی فاتح کی طرح
آج اندازہ ہوا عشق کا سودا کیا ہے

کوئی ساحل سے پیاسا ہی پلٹ جائے اگر
پھر سراب ہے وہ کسی دشت کا، دریا کیا ہے

ناشناسی میں تری ذات کو سجدہ کرنا
خود فریبی کے سوا اور خدارا کیا ہے

درد جو دل سے لگا ہے وہ کدھر جائے گا
اک مسافر کی طرح لوٹ کے گھر جائے گا

آئینہ خانۂ دل جب بھی بکھر جائے گا
میرے افکار کا چہرہ تو سنور جائے گا

فصلِ گل تیری حقیقت بھی ہمیں ہے معلوم
پھول کھلتے ہی ہواؤں میں بکھر جائے گا

سرکشی اس کے ارادوں کا پتہ دیتی ہے
اب کے دستار کی باری نہیں سر جائے گا

یہ بیابان صفت ہے اسے کیا شہر سے کام
قافلہ قیس کا صحرا میں اتر جائے گا

جو جنوں ساز ہے گلشن میں ہو یا صحرا میں
بجلیاں ڈھونڈ ہی لیں گی وہ جدھر جائے گا

آئی بہار پھول کھلا اور بکھر گیا
خوشبو کا ایک جھونکا چمن سے گزر گیا

سرکش سی خواہشات کی لہریں بھی سو گئیں
اور رفتہ رفتہ عشق کا دریا اتر گیا

بنیاد ریت کی تھی بچاتے بھی کِس طرح
طوفان آیا اور گھروندا بکھر گیا

مجھ کو مِرے وجود سے وہ کرکے روشناس
اِک شخص تھا ہوا کی طرح جو گزر گیا

کیا نیند تھی کہ لوگ تہہِ خاک سو گئے
مٹی میں مل کے خاک کا پیکر بکھر گیا

درد رکتا ہے تو کچھ اور گھٹن ہوتی ہے
شامِ زنداں کی طرح صبحِ وطن ہوتی ہے

ایک وہ خواب کیا ٹوٹا ہے، مری آنکھوں سے
نیند رخصت ہوئی ہر وقت چبھن ہوتی ہے

شام کو گھر کی طلب اور بھی بڑھ جاتی ہے
جب کبھی دشت نوردی میں تھکن ہوتی ہے

چارہ گر مجھ کو مرے حال پہ رہنے دیتے
پرسشِ حال سے تو اور دکھن ہوتی ہے

ہجر کے ماروں سے پوچھو نہ مسافت شب کی
لمحۂ عشق میں صدیوں کی تھکن ہوتی ہے

پیرہن چاک کیے جب بھی بہار آئی ہے
ہم جنوں سازوں کو صحرا کی لگن ہوتی ہے

تم میرے دردِ دل میں شراکت نہیں کرو
سرمایۂ حیات پہ حیرت نہیں کرو

آنچل کو میرے سر سے اُڑانے کی جستجو
اے موجۂ ہوا یہ شرارت نہیں کرو

اے دورِ بے ہنر یہاں تسکینِ ذوق میں
گر ہاتھ بھی قلم ہو تو حیرت نہیں کرو

پیاسوں کا امتحان ہے دریا کے سامنے
عباسؑ مشک بھرنے کی زحمت نہیں کرو

سیدانیوں کے سر سے رداؤں کو چھیننا
اے بانیِ جفا یہ قیامت نہیں کرو

صرف تخریب ہے تعمیر نہیں
اپنے خوابوں کی یہ تعبیر نہیں

ہاتھ خالی ہیں ہمیشہ کی طرح
کیا دعاؤں میں بھی تاثیر نہیں

ناخدا نے تو ڈبو دی کشتی
اس میں شامل میری تقدیر نہیں

زندگی مثلِ صحیفہ ہے مگر
کوئی معنی کوئی تفسیر نہیں

نکتہ چیں تیری زباں بند ہے کیوں
کیا کماں میں کوئی اب تیر نہیں

کچی سڑکیں ہیں سفر لمبا ہے
کوئی ساتھی کوئی رِہ گیر نہیں

آئینہ تھا مرا چہرہ شاید
جس میں اپنی کوئی تصویر نہیں

یوں صنم خانۂ دل لوگو سجائے رکھا
تیز آندھی میں دیا ہم نے جلائے رکھا

شہر کو چھوڑ کے صحرا کی طرف ہجرت کی
وحشتِ دل کو بہر طور نبھائے رکھا

اس کے ترکش میں بہت تیر ابھی باقی ہیں
طائرِ دل کو شکاری سے بچائے رکھا

تخمِ امید میں بڑھتا ہی رہا شوقِ نمو
خشک سالی میں بھی اِک پیڑ لگائے رکھا

زندگی گرد مرے رقص کناں رہنے لگے
ایک شوق ایسا بھی تو دل سے لگائے رکھا

غم ملا اس طرح کہ خوشی بن گیا
درد ہی حاصلِ زندگی بن گیا

وقت بدلا تو ہر شے بدلنے لگی
ایک ساتھی تھا جو اجنبی بن گیا

ہجر کی شب اندھیرے کے پیشِ نظر
داغِ دل جل اٹھا روشنی بن گیا

خاک، پانی، ہوا، آگ جب مل گئے
وصفِ تخلیق سے آدمی بن گیا

کھو گیا آج شاید عصائے کلیم
پورا دربار پھر افعی بن گیا

پرانے خوابوں کی دستک کا پھر سبب کیا ہے
جو رات کاٹ دی پچھتاوا اس کا اب کیا ہے

فضائیں دل کی ہیں ماتم کناں مگر پھر بھی
تمنا پوچھ رہی ہے تری طلب کیا ہے

سروں کی فصل ہے سیراب خوں کی نہروں سے
زمین گر یہ لرزنے لگے عجب کیا ہے

شریکِ بزم کوئی بے ادب بھی رہنے دو
یہ امتیاز تو باقی رہے ادب کیا ہے

بس اکتسابِ غمِ زندگی کا فیض ہے یہ
قبیلِ درد کا شجرہ ہے کیا نسب کیا ہے

ہے برگِ زرد میں پیغامِ فصلِ گل لیکن
خزاں کے لہجے میں یہ نغمۂ طرب کیا ہے

چراغ ، چاند ، ستارے ہوں فکر کے روشن
سروشِ خامہ کی آمد نہ ہو تو شب کیا ہے

خلش دل کی بڑھانا چاہتی ہوں
تمھیں پھر آزمانا چاہتی ہوں

فرازِ بندگی کی انتہا ہے
خدا کے پاس جانا چاہتی ہوں

مجھے معلوم ہے انجام اپنا
میں پھر بھی سر اٹھانا چاہتی ہوں

مری آنکھوں کو جو حیران کر دیں
وہی سپنے سجانا چاہتی ہوں

کوئی بادِ مخالف کو خبر دے
سفینہ آزمانا چاہتی ہوں

جو میرے شہرِ دل میں بس گیا ہے
اسے میں بھول جانا چاہتی ہوں

میں اپنا خون مٹی میں ملا کر
نئے پودے لگانا چاہتی ہوں

بسایا تھا جسے چاہت سے میں نے
اسے اب بھول جانا چاہتی ہوں

بجھ گیا دل مگر گلہ نہ کیا
بر خلاف اس کے فیصلہ نہ کیا

سب کو آئینے سے رہا شکوہ
ذات کا اپنی تجزیہ نہ کیا

ایک اِک گام پر لگی ٹھوکر
پھر بھی رکنے کا فیصلہ نہ کیا

بن گیا عشقِ مستعار اک دن
اس نے قرضِ وفا ادا نہ کیا

یادِ ماضی کے کوہساروں کا
ہم نے کس شام سلسلہ نہ کیا

کتنی خوبی سے داستاں کہہ دی
اک ہمارا ہی تذکرہ نہ کیا

ہٹ کے محور سے زمانے میں بھٹکنا ہی پڑا
مجھ کو تحلیلِ ہوا ہو کے بکھرنا ہی پڑا

زندگی تو مجھے ہر طور بسر کرنا تھی
عمر کے جام کو ہر حال میں بھرنا ہی پڑا

مجھ کو فرسودہ روایات سے نفرت تھی بہت
اس کی پاداش میں پھر بھینٹ بھی چڑھنا ہی پڑا

اس توقع پہ نئی صبح کبھی ہوگی طلوع
سینکڑوں تاروں کو تو دار پہ چڑھنا ہی پڑا

پھول کا جرم تھا رنگینی و خوشبو اس کی
اس خطا پر اسے اک روز بکھرنا ہی پڑا

اک طرف کھائی تھی اور ایک طرف پانی تھا
مجھ کو ہر گام پہ گر گر کے سنبھلنا ہی پڑا

اپنی ہستی فقط اک رات کی مہماں ٹھہری
موم کے شہر کو سورج میں پگھلنا ہی پڑا

چاندکو چمک دے کر مجھ کو ڈوب جانا ہے
ماں کا معتبر منصب اس طرح نبھانا ہے

موسموں کی بھٹی میں ذہن ہو گیا کندن
جانے اور کتنا اب اس کو آزمانا ہے

جسم کی ریاست پر ذہن کی حکومت ہے
نیم جاں تمناؤ تم کو ہار جانا ہے

اپنی چیز کھونے کا دکھ کسے نہیں ہوتا
خود سپردگی پر اب اشک ہی بہانا ہے

بے چراغ رستے ہیں حوصلے شکستہ پا
قافلہ امیدوں کا کس طرف روانہ ہے

سائلِ رحم و کرم پہ یہ نوازش کیسی
جلتے سورج کی رتوں میں یہاں بارش کیسی

سات رنگوں کی ملاوٹ سے کرن بنتی ہے
ایسی صورت میں فقط اپنی نمائش کیسی

بو کے فتنوں کو مرے شہر میں وہ پوچھتا ہے
کوئی بتلائے کہ ہوتی ہے یہ شورش کیسی

ہر گنہ پر مرا دل مجھ پہ ملامت ہے کرے
اس عدالت میں مری جان کی بخشش کیسی

دل ہے اللہ کا گھر نارِ حسد کیسے لگی
بھلا کعبہ میں یہ آتش کی پرستش کیسی

❁

رات ہے اماوس کی اور چراغِ شب جاناں
خوف سے ہواؤں کی لَو ہے جاں بلب جاناں

آس کی طنابوں کو کھینچ کر وہ کہتے ہیں
خیمۂ تمنا میں اور کوئی طلب جاناں

خوشبوؤں کی بارش میں نور کی روانی تھی
کیسے بھول جاؤں میں موسمِ طرب جاناں

بیعتِ ریا سے جب ہاتھ میں اٹھاتی ہوں
پوچھتے ہیں سب مجھ سے نام اور نسب جاناں

فیضؔ جوشؔ اور زیدیؔ کون اب رہا باقی
کس طرح سجے گی پھر محفلِ ادب جاناں

روح کی اسیری میں فکر کی یہ آزادی
یہ رہائی بھی کیسی لگتی ہے عجب جاناں

ہرے درختوں کی رنگت اڑی ہوئی کیوں ہے
یہ شمعِ عشق نجانے بجھی بجھی کیوں ہے

سنہرے خواب بُنے تھے مِرے خیالوں نے
اب آنکھ میں مری ہر دم نمی نمی کیوں ہے

تراشتا کوئی ہم کو تو ہم بھی ہیرا تھے
یہ ہر مقام پہ احساسِ کمتری کیوں ہے

سمن گلاب کی خوشبو کو ہم ترستے ہیں
فضا چمن کی یہ بارود میں بسی کیوں ہے

ہر ایک ہاتھ میں تیغ و تبر ہیں بھالے ہیں
پسِ نگاہ یہ نفرت چُھپی ہوئی کیوں ہے

چراغ گھر کے لگاتے ہیں آگ گھر گھر کو
یہ آگ کِینہ کی دل میں لگی ہوئی کیوں ہے

عجیب سحر سا طاری ہے یاں فضاؤں میں
عصائے موسیٰؑ کی ضربت، رکی ہوئی کیوں ہے

خودشناسی کا زہر گھولتی ہوں
بند بابِ طلسم کھولتی ہوں

تابشِ فکر کی بدولت میں
کور چشموں کے دل ٹٹولتی ہوں

میں مسِ خام ، وقت کیمیا گر
گوہرِ آبدار رولتی ہوں

سارے گنجِ گراں قلم میں مِرے
قفلِ ابجد اگر میں کھولتی ہوں

گونگے بہروں کے شہر میں ناحق
میں فصیح و بلیغ بولتی ہوں

اس تفاوت کا مرے غافل کو اندازہ نہیں
یہ خلش کُہنہ ہے میرا زخمِ دل تازہ نہیں

شہرِ ناپُرساں سے اب واپس پلٹنا ہے محال
ہر طرف دیوار ہے کوئی بھی دروازہ نہیں

پھرانا الحق کی صدا کانوں میں گونجی ہے مرے
وقت کے منصور کو کیا خوفِ خمیازہ نہیں

اب تو فصلِ گل بھی پیغامِ اجل دینے لگی
پھول کے چہرے پہ خونِ دل ہے یہ غازہ نہیں

صرف ترتیبِ عناصر میں تغیر کیا ہوا
چارہ گر کے پاس بھی اب کوئی شیرازہ نہیں

ورد اور تنہائی میں کیسے بسر کرتے ہیں لوگ
اے شبِ فرقت کسی کو اس کا اندازہ نہیں

خواب بکتے نظر آنے لگے بازاروں میں
کہیں یوسفؑ نہ چلا آئے خریداروں میں

شہرِ معتوب میں ہیں دار و رسن کے چرچے
دلِ منصور بھی شامل ہے گنہ گاروں میں

حائلِ راہ ہوں پتھر تو کوئی بات نہیں
جذبۂ صدق سے در بنتے ہیں دیواروں میں

شہر کو پھونک کے ہو گا نہ علاجِ ظلمت
درد تقسیم کیا جائے نہ بیماروں میں

گم شدہ جو ہیں تمنائیں صدا دو اُن کو
عہدِ رفتہ کہیں خوابیدہ نہ ہو غاروں میں

نقشِ حیرت ہیں سبھی کار گہِ ہستی میں
بے ثباتی کے نشاں پاؤ گے گلزاروں میں

گونگے، بہروں میں بھلا نطق وفصاحت کیسی
بدگمانی کی فضا ہو تو صراحت کیسی

انقلاب آئے نہ لوگوں کو کوئی حق ہی ملے
یہ مرے شہر میں ہوتی ہے بغاوت کیسی

بوالہوس دعویٰ ِ عشاق کو دہراتے ہیں
کوئی بتلائے کہ ہوتی ہے محبت کیسی

اس کی محفل سے جو لوٹے تو یہ معلوم ہوا
ایک مرکز میں سمٹ آتی ہے وسعت کیسی

شب کو چوکھٹ پہ دِیا روز جلا کر سوچوں
راہ تکنے کی بھی ہوتی ہے یہ عادت کیسی

اس سے بہتر تھا کہ خود سے نہ شناسا ہوتی
آگہی تو نے بنادی مِری حالت کیسی

نیند کا قحط ہے خوابوں کے شجر پیلے ہیں
شبنمی آنکھ سے عارض بھی مرے گیلے ہیں

کسی نے سورج کو مری فکر کی ضَو بخشی ہے
آج کی صبح مناظر بڑے چمکیلے ہیں

ہم طلب کچھ نہ کریں گے جو تو انکار کرے
مصلحت نام ہے جس شے کا ترے حیلے ہیں

فخرِ دارا ، نہ سکندر کا تکبّر باقی
اونچے محلوں کی جگہ ریت کے کچھ ٹیلے ہیں

زہر یہ کس نے فضاؤں میں یہاں گھول دیا
عارضِ لالہ و گل سرخ نہیں نیلے ہیں

قریۂ چاند میں کیوں دشت کی تنہائی ہے
راستے گھر کے ترے کس لیے پتھریلے ہیں

حدیثِ زیست کی تفسیر مجھ کو مل جائے
دعا کرو مری تقدیر مجھ کو مل جائے

طلوعِ خوابِ تمنا ہے چشمِ حیرت میں
خدا کرے کوئی تعبیر مجھ کو مل جائے

ہیں منتشر سے خدو خال میری ہستی کے
پرانی اپنی ہی تصویر مجھ کو مل جائے

میں چھوڑ دوں گی زمانے کو تیری خاطر اب
مگر وہ پاؤں کی زنجیر مجھ کو مل جائے

جو نکتہ سنج ہواؤں کا رخ بتاتا ہے
اُسی کی آنکھ کی تحریر مجھ کو مل جائے

چراغ سامنے جب بھی ہوا کے آیا ہے
لہو کا رنگ فضاؤں میں جگمگایا ہے

غبارِ عہدِ تمنا ہے سب کے ماتھے پہ
خدایا گردشِ دوراں کو کیوں بنایا ہے

جب اپنے پاؤں کی زنجیر کے ہوئے عادی
کسی نے حکمِ رہائی ہمیں سنایا ہے

جو بات حرف و معانی سے ماورا ٹھہری
لبِ خموش نے قِصّہ وہی سنایا ہے

وہ میری ماں جو دعاؤں کا ایک مخزن ہے
شدید دھوپ میں اس کا ہی سر پہ سایہ ہے

غم کا آنچل ڈھلک گیا ہو گا
اشک یوں ہی ٹپک گیا ہو گا

اس نے جب سوچا ہو گا مجھ کو تو
اس کا کمرہ مہک گیا ہو گا

آہ مظلوم کی ہے پُر تاثیر
نالہ تا بہ فلک گیا ہو گا

رِند کے کوچ کی ہے تیّاری
جامِ ہستی چھلک گیا ہو گا

شہر بھر آگ کی لپیٹ میں ہے
کوئی شعلہ بھڑک گیا ہو گا

کمک نہ آئے گی تم انتظار مت کرنا
یہ اہلِ کوفہ ہیں کچھ اعتبار مت کرنا

پسِ کلام جہاں مصلحت کے پردے ہوں
تم ایسے دوستوں کا اعتبار مت کرنا

اگر ہو فکر کی تطہیر پاسباں تیری
کبھی بھی دامنِ دل داغ دار مت کرنا

ہزار رنج و مصائب بدل دیں شکل تری
نوائے تلخ مگر اختیار مت کرنا

جہاں میں حرفِ مکرر نہیں ہے کوئی بشر
پلٹ نہ پاؤں گی میں انتظار مت کرنا

ہوائے تُند نے کمزور سے دِیے سے کہا
کسی پہ عیب کبھی آشکار مت کرنا

شہرِ کوفہ تری تعریف میں کیا کیا لکھیں
گر قلم ساتھ دے قاتل کا قصیدہ لکھیں

طاقِ نسیاں پہ یہ اک شمع جلے گی کب تک
ہم دھوئیں سے چلو سورج کو عریضہ لکھیں

شہرِ معتوب میں عہدوں سے معطل جو ہوئے
سوچتے ہیں انھیں کچھ لفظِ شکیبا لکھیں

اپنی مٹی سے محبت کا صلہ ہے یہ بھی
اپنے ہی لوگ ہمیں راہ کا کانٹا لکھیں

معتبر جو ہوئے دنیا میں ہمارے دم سے
کیا عجب وقت ہے ہم کو وہی رسوا لکھیں

اپنے ہی گھر میں کوئی اس طرح مہمان نہ ہو
یہ تماشا مری رسوائی کا سامان نہ ہو

مجھ کو ہر دیپ محبت کا بُجھا دینا ہے
اس نئے طور پہ دل ، دیدۂ حیران نہ ہو

میں نے اس واسطے آنکھوں کو جلا رکھا ہے
واپسی کے لیے رستہ کوئی ویران نہ ہو

بیوفائی میں وہ ہے طاق، مروّت میرا فن
روح کا زخم مرے جسم کا سرطان نہ ہو

میں اسے چھوڑ کے تنہائی کا سودا کر لوں
کاش یہ فیصلہ میرے لیے آسان نہ ہو

وہ مرا پہلا قدم تھا مری نظروں کا فریب
کسی پیاسے کے مقدر میں بیابان نہ ہو

قتل کرتا ہے مجھے میرے ہی ہتھیار سے وہ
اس سا دانا کوئی اور مجھ سا بھی نادان نہ ہو

کیا ہو تعریف لا جواب تھا وہ
زندگی بھر کا انتخاب تھا وہ

تم نے اس کو نہیں پڑھا لیکن
یوں سمجھ لو کھلی کتاب تھا وہ

صاف گوئی تھی خار کے مانند
خوبیوں میں مگر گلاب تھا وہ

اس رفاقت کا ذکر یوں سمجھو
رات کے بعد آفتاب تھا وہ

آنکھ کی سوئیاں نکل نہ سکیں
کیونکہ پچھلے پہر کا خواب تھا وہ

دل تمناؤں کا سوکھا ہوا جنگل کیوں ہے
نقشِ رفتہ کا ہر اِک ذہن میں مقتل کیوں ہے

ایک اک بوند کے مشتاق ہیں سب تشنہ دہن
جب برستا نہیں تو سر پہ یہ بادل کیوں ہے

غلبۂ تیرگی بڑھتا ہی چلا جاتا ہے
ظلمتِ شب میں دیا میرا معطل کیوں ہے

فکر کے باب پہ دستک بھی کوئی دیتا نہیں
بے ہنر دور ترا ذہن مقفل کیوں ہے

خشک سالی ہی مری آنکھ کی قسمت ہے تو پھر
چشمِ احساس میں پھیلا ہوا کا جل کیوں ہے

❁

اسے یاد رکھنا محال تھا مجھے بھولنے پہ ملال تھا
مری فکر کو جو جلا ملی وہ ترا ہی حسنِ خیال تھا

کبھی گردشِ وقت نے آج تک مِرے حوصلے کو نہ مات دی
جو ہوا کے رخ پہ تھا ضَوفشاں وہ مرا چراغ کمال تھا

یہ ہر ایک شام دِیا جلا کے ہواؤں سے مرا پوچھنا
تم ہی کچھ بتاؤ کہ کیا ہوا مرا آخری جو سوال تھا

فقط ایک ضربِ خفیف سے میرا آ بگینہ بکھر گیا
جو بکھر گیا تو پتہ چلا کہ سمٹنا کتنا محال تھا

رمِ آہو جیسے گریز پا ہو خود آگہی کے سراب میں
وہی ہجرتوں کا فریب تھا وہی زخمی دل کا غزال تھا

کوئی کیا بتائے کہ زیست میں نہ کشش رہی نہ مزا رہا
جو گزر گیا وہ شباب تھا جو بکھر گیا وہ جمال تھا

شہرِ خاموش کے مہمان کو جانے دیجے
بے کس و بے سر و سامان کو جانے دیجے

بد گمانی نے اگر ڈال لیا ہے ڈیرا
بن بلائے ہوئے مہمان کو جانے دیجے

آپ تعبیر پہ نادم ہیں کوئی بات نہیں
میرے اس خوابِ پریشان کو جانے دیجے

لکھ رہی ہوں میں رفاقت کی سنہری یادیں
میرے مضمون کے عنوان کو جانے دیجے

راہیِ شہرِ عدم نے کُھلی آنکھوں سے کہا
آپ اس دیدۂ حیران کو جانے دیجے

دشتِ پُر خار کی ویرانی بڑھانے کے لیے
چاکِ دل ، چاکِ گریبان کو جانے دیجے

ایک ویرانے کی آبادی کے ہی پیشِ نظر
خلد سے حضرتِ انسان کو جانے دیجے

❁

بُجھا بُجھا سا تھا وہ بھی ، اُداس میں بھی تھی
چراغِ آخرِ شب کا قیاس میں بھی تھی

یہ اور بات کہ دنیا کو تج دیا لیکن
وہ جانتا ہے زمانہ شناس میں بھی تھی

جو داستان سنائی گئی زمانے کو
اسی کا ایک حسیں اقتباس میں بھی تھی

شجر نے پیرہنِ کُہن کو اتار دیا
بدلتی رُت کا پرانا لباس میں بھی تھی

ہلال بن کے وہ اُبھرا تو اس کی محفل میں
مثالِ ہالہ کبھی آس پاس میں بھی تھی

مجھے تو وہ در و دیوار یاد آتے ہیں
کہ جس مکان کی پختہ اساس میں بھی تھی

یقین ہو گیا بازی پلٹتی ہے کیسے
کہ ڈوبتے ہوئے ساحل کے پاس میں بھی تھی

میں ہوں اک عبد اور تو معبود
دل کی وسعت ہے کتنی لامحدود

فکر کا جب دریچہ کھل جائے
سامنے ہوتا ہے تمھارا وجود

ہیں سخن ور گلی گلی لیکن
کیوں سخن فہم ہو گئے معدود

راہی شوق پھر پلٹ نہ سکا
گھر کا ہر راستہ ہوا مسدود

نہ شکیبائی اور نہ مرہمِ زخم
چارہ گر آج کل ہوئے مفقود

با بصیرت کے واسطے ہے بہت
خاک کا فرش اور چرخِ کبود

عشق آسودگی اور عشق تھکن
راستہ ہی ہے منزلِ مقصود

سب حقائق سے ماورا تھا وہ
میرے خوابوں کا سلسلہ تھا وہ

گردشِ وقت نے کی کوزہ گری
چاک پر گھومتا رہا تھا وہ

خُلد سے آج تک بھٹکتے ہیں
کیا مشیّت کا فیصلہ تھا وہ

آج شِدّت سے یاد آتا ہے
میں نے جس کو بُھلا دیا تھا وہ

آسماں اور زمین سے بڑھ کر
مجھ میں اور اس میں فاصلہ تھا وہ

اس کا ہر رنگ چڑھ گیا مجھ پر
میری خوشبو میں ڈھل گیا تھا وہ

کیوں دعائیں نہ مستجاب ہوئیں
کس ریاضت سے مانگتا تھا وہ

نگاہِ ناز جو بدلی جہاں بدلنے لگا
زمیں بدلنے لگی آسماں بدلنے لگا

ہوا چلی ہے جو ہجرت کی اس زمانے میں
ہر اک پرندہ یہاں آشیاں بدلنے لگا

نیا ہے عہد نئے عہد کے تقاضے ہیں
اسی خیال سے وہ مہرباں بدلنے لگا

خطِ نفاق سے دیوارِ دل اٹھائی گئی
نہ جی ملا تو وہ اپنا مکاں بدلنے لگا

حسین رنگ بکھرنے لگے ہیں منظر پر
وہ مہربان ہوا اور سماں بدلنے لگا

ہمیں تو قول پہ اس کے یقین تھا لیکن
یہ کیا ہوا کہ وہ اپنا بیاں بدلنے لگا

سر کی قیمت کہاں باقی رہی دستار کے بعد
کچھ بھی دامن میں نہیں دولتِ کردار کے بعد

رائیگاں ہو گئے سجدے کسی انکار کے بعد
خلد ویران رہی ایک گناہ گار کے بعد

تو سخی ہے تو اِدھر بھی ہے بہت خودبینی
کون مانگے گا بھلا پھر ترے انکار کے بعد

اب بھلا کون بتائے کہ گزرتی کیا ہے
آنگنوں میں نہ تعلق رہا دیوار کے بعد

اس کا انداز بہاروں سے بہت ملتا تھا
پھول چنتی تھی صبا شوخیِ گفتار کے بعد

اس کی آنکھوں کی چمک سے ہی دِیے جلتے تھے
پھول گلشن میں کھلا کرتے تھے دیدار کے بعد

یوں ہنر مندی کا دنیا سے صلہ پایا ہے
انگلیاں کاٹ دی ہیں قیمتی شہکار کے بعد

کچھ اس طرح سے عشق کا سودا کیا گیا
تقسیم ہو رہی تھی میں باقی نہ کچھ بچا

منصب پیام بر کا صبا نے ادا کیا
ہر پھول کی زبان پہ تھا میرا مدعا

گھر بھر کی تیرگی کو مٹانے کے واسطے
دل بجھ گیا چراغِ ضرورت جلا کیا

تازہ ہوا سے فکر کے غنچے کِھلا کِیے
اک ذہن کا دریچہ کُھلا تھا کُھلا رہا

ہر سمت ہو رہی ہے عقیدے پہ سرد جنگ
لیکن عمل کا باب تو کورا پڑا رہا

نکل تو آیا ہے سورج مگر سحر نہ لگے
میں جس مکان میں رہتی ہوں مجھ کو گھر نہ لگے

کشش نگاہوں کی اندازِ گفتگو کو لکھوں
اُسے لکھوں تو کوئی لفظ معتبر نہ لگے

نصیب بھی ہیں جدا اور منزلیں بھی جُدا
وہ میرا دوست تو لگتا ہے ہم سفر نہ لگے

ابھی تو گیسوئے خواہش نہ ہو سکے تھے دراز
شبِ حیات کبھی اتنی مختصر نہ لگے

بغیر شوقِ جنوں اور بغیر سنگِ وفا
یہ صرف بوجھ ہے کندھوں پہ میرے سر نہ لگے

میں ہوں زمینِ محبت اور آسمان ہے وہ
ہوا کے رُخ کی خبر دے گا بادبان ہے وہ

یہ اکتسابِ غمِ عشق کی کہانی ہے
میں ایک حرف ہوں اور پوری داستان ہے وہ

فقط ہمِیں کو نہیں ناز اپنی اُردو پر
جو دوسروں کو بھی اچھی لگے زبان ہے وہ

نئے ہیں جام نئے ساقی اور نئے میکش
جہاں مکین بدلتے رہے مکان ہے وہ

یہ بڑھ کے قبر کے کتبے نے قافلے سے کہا
جہاں پڑاوَ ڈلے گا یہی نشان ہے وہ

❁

اے شہرِ انتشار مسرت کہاں گئی
میں ہوں تلاش میں میری جنت کہاں گئی

ساری علامتیں تو ہیں محشر کی ہر طرف
بے احتساب کے یہ قیامت کہاں گئی

آنکھوں میں کیوں لحاظ کی باقی نہیں چمک
کردار سے نکل کے مروّت کہاں گئی

مرنے پہ لوگ جشن مناتے ہیں کس لیے
خوں بہنے پر جو ہوتی تھی وحشت کہاں گئی

دل کی خلش نے اس کو کہیں کا نہیں رکھا
بے وجہ مسکرانے کی عادت کہاں گئی

بے جرم کے سزا ہمیں منظور ہے مگر
انصاف دینے والو عدالت کہاں گئی

میرے چارہ گر تجھے کیا خبر جو عذابِ ہجر و وصال ہے
یہ دریدہ تن یہ دریدہ من تری چاہتوں کا کمال ہے

مجھے سانس سانس گراں لگے یہ وجود وہم و گماں لگے
میں تلاش خود کو کروں کہاں میری ذات خواب و خیال ہے

وہ جو چشمِ تر میں ٹھہر گیا وہ ستارہ جانے کدھر گیا
نہ نشاطِ غم کا ہجوم ہے ، نہ ہی سبز یاد کی ڈال ہے

اُسے فصل فصل بھی سینچ کر ملا سایہ اور نہ کوئی ثمر
یہ عجیب عشق کا پیڑ ہے یہ عجیب شاخِ نہال ہے

مرا حرف حرف اسی کا ہے مرے خواب خواب میں وہ بسا
جو قریب رہ کے بھی دور ہے اسے پانا کتنا محال ہے

زباں کھولو نہیں حرفِ مدعا کے لیے
ہوا دِیے نہ بجھایا کرو خدا کے لیے

ثمر بھی توڑ لیے اور شجر بھی کاٹ دیا
اب اور نذر کریں کیا نئی جفا کے لیے

ہم اپنے نام کی تختی ہٹا تو دیں لیکن
مگر شناخت کا ہے مسئلہ سدا کے لیے

حسین خواب کے بدلے صلیب و دار و رسن
مرا قبیلہ بنا ہے فقط سزا کے لیے

اندھیرے سے کبھی سمجھوتہ ہو نہیں سکتا
چراغ ہم نے جلا رکھے ہیں ہوا کے لیے

اور اس کے بعد بھی فیضانِ عام گر نہ ہوا
اٹھیں گے ہاتھ نہیں پھر کسی دعا کے لیے

رہِ حیات میں ایسے مقام سے گزرے
جہاں پہ پینا پڑا زہر بھی دوا کے لیے

خواب رخصت ہوئے آنکھوں میں کھٹک باقی ہے
دل کے زخموں پہ چھڑکنے کو نمک باقی ہے

بارشِ وصل کا حاصل ہی کیا یادوں کے سوا
افقِ زیست پہ اب جس کی دھنک باقی ہے

آنکھ چھن سکتی ہے پر خواب نہیں چھن سکتے
اب بھی زنجیرِ تمنا میں کھنک باقی ہے

قتل کے بعد وہ گھر بار جلا ڈالے گا
روئے قاتل پہ تعصّب کی چمک باقی ہے

وہ بدل بھی گئے اغراض و مقاصد کے لیے
ہم میں تہذیب و مروّت کی جھلک باقی ہے

بے اماں ہو کے بھی ہے پاؤں کے نیچے یہ زمین
سایہ کرنے کو ابھی سر پہ فلک باقی ہے

یاد آنے لگے وہ سارے مراسم پھر سے
زخم تو بھر بھی گئے دل میں کسک باقی ہے

❁

شامِ وصال ڈھل گئی ہجر کی شب ہے خیمہ زن
کون رفو کرے مرا یہ تار تار پیرہَن

قلب ونظر سے سب حجاب رفتہ ہی رفتہ اٹھ گئے
خلوتِ ذات میں بھلا کرتا ہے کون پھر سخن

ایک فریب آرزو نادم ہے ساری جستجو
جیسے جبینِ زیست پر اُبھری ہوئی کوئی شکن

چارہ گری کا ذکر کیا ، ہے یہ جہانِ نارسا
کار گہہِ حیات میں ہونے لگی بڑی تھکن

بس ایک مشتِ خاک میں عالمِ آب وگل چھپا
جیسے کہ اپنی ذات میں سمٹی ہوئی ہو انجمن

تاریخ لہو رو رہی ہے
لاشوں پہ سیاست ہو رہی ہے

وحشتیں بیدار ہیں ہر اک سو
شاید کہ انسانیت سو رہی ہے

آرزوئیں کرکے چشمِ حیرت
کیوں قدر اپنی کھو رہی ہے

ہم لوگ سزا وار ہیں اِسی کے
نفرتیں جو نئی نسل بو رہی ہے

بے رنگ دامنِ آرزو ہوا ہے
بارشِ وصل داغِ ہجر دھو رہی ہے

یا یقین دے یا گمان دے یا تو قتل کر یا امان دے
بڑی کشمکش میں ہے زندگی میرے چارہ گرتو دھیان دے

نہ فریبِ غم میں ہی زیادتی نہ ہی تشنگی میں کمی ہوئی
جونصیب میں ہیں سراب تو میرے آبلوں کوزبان دے

ہے عجیب طرزِ گداگری کہ غموں کی دین قلندری
مرا دامنِ صبر وسیع کر مرے دشمنوں کو امان دے

اسی شامِ غم کا ہے فیصلہ جو چھنی تھی سر سے مرے ردا
میں تری پناہ میں ہوں خدا مرے حق میں کوئی بیان دے

نظر کے پاس ہونا دل کی قربت ہو نہیں سکتی
تصور میں بسا کر کیا محبت ہو نہیں سکتی

کوئی یہ حال دیکھے دل کے یوں سرشار ہونے کا
کہ کعبہ میں بھی ہرگز یہ عبادت ہو نہیں سکتی

ہوئے برباد سجدے ایک حرفِ ''لا'' کے کہنے سے
بغاوت ساتھ ہو تو پھر اطاعت ہو نہیں سکتی

نہ ہوگا فرق قول و فعل میں ہم کو پرکھ لینا
کبھی بھی سادہ لوگوں سے سیاست ہو نہیں سکتی

قاتل اماں نہ دے تو مجھے قتل گاہ میں
کب تک رہوں گی اپنے عدو کی پناہ میں

طوفاں کے بعد آنکھ میں ٹھہراؤ آ گیا
اے دل تو روک لے مرے یوسف کو چاہ میں

تنہائی اور اُداسی کی عادت سی ہو گئی
اب لطف آ رہا ہے غموں سے نباہ میں

حسنِ بیاں کی بات نہیں کیا بتائیں ہم
اس کا ہے کیا مقام ہماری نگاہ میں

❁

موسمِ گُل میں پرندوں نے شجر چھوڑ دیا
حوصلہ ساتھ رکھا زادِ سفر چھوڑ دیا

خواہشِ ترکِ تمنا بھی تو پوری نہ ہوئی
ہم چلے آئے ! اِدھر دل کو اُدھر چھوڑ دیا

حسرتیں چاک گریباں ہیں نہ بخیہ نہ رفو
کیا مسیحا نے مرے کارِ ہنر چھوڑ دیا

خشک پتوں کو رہا سامنا تنہائی کا
ساتھ خوشبو نے ترا بھی گلِ تر چھوڑ دیا

گھر کی چوکھٹ کو پار کرنا پڑا
آنکھ کو سوگوار کرنا پڑا

دھوپ تھی سر پہ اور کڑا تھا سفر
غم کے صحرا کو پار کرنا پڑا

دل نے مجبور کر دیا آخر
آپ پر اعتبار کرنا پڑا

نا امید ہو کے بھی دعا مانگی
یہ گنہ بار بار کرنا پڑا

ساتھ اس نے نہ دیا میرا دعاؤں کی طرح
میں تھی اک شمع مگر وہ تھا ہواؤں کی طرح

اب تو بس ریت پہ قدموں کے نشاں باقی ہیں
مجھ میں اک شخص سمایا تھا خداؤں کی طرح

چارہ گر میرا شناسا ہے مِرے زخموں سے
وہ مجھے درد بھی دیتا ہے دواؤں کی طرح

جرمِ تخلیق میں شامل ہے مرا مالک بھی
زندگی کا بھی رویہ ہے سزاؤں کی طرح

عشق میں جاں سے گزرنا تو کوئی بات نہیں
شہرِ خوباں میں مگر ایسی روایات نہیں

آنکھ ہی فیصلہ کر لیتی ہے دل کے حق میں
سوچنے اور سمجھنے کی کوئی بات نہیں

آگے بڑھتے رہو چھٹ جائے گی یہ ظلمتِ شب
صرف تمہیدِ سحر ہے یہ کوئی رات نہیں

آگ گلزار بنے چاہ سے یوسفؑ نکلے
اب ترے عشق میں کیا ایسی کرامات نہیں

خواہشوں کی تتلیاں

کہر میں ڈوبا ہوا ماحول وہ ٹھنڈی ہوا
دور تک سبزے کا اک دل آفریں سا سلسلہ
ایک بچہ دور تک تتلی کے پیچھے بھاگتا
اک معطّر یاد کا جھونکا مجھے چونکا گیا
میں بھی منزل کے تعاقب میں یونہی پھرتی رہی
گردِ رہ اُڑ اُڑ کے میری مانگ کو بھرتی رہی
ہاتھ تو کچھ بھی نہ آیا ہاتھ ہی ملتی رہی
خود دھواں بن کے میں سب کو روشنی دیتی رہی
کچھ سنہری خواب آنکھوں میں بکھر کر رہ گئے
تتلیوں کے رنگ ہاتھوں میں اتر کر رہ گئے

بکھرے خواب

ایسی اک شب جو طلسمات لیے آئی تھی
کتنے مہتاب تمناؤں کے روشن دیکھے
کتنی کلیاں تھیں دریچے پہ جو مسکائی تھیں
بام پہ کتنے ستارے سے اتر آئے تھے
کلمۂ لب سے نہیں آنکھوں سے باتیں کی تھیں
حسنِ فطرت نے ہمیں بڑھ کے صدائیں دی تھیں
حجرۂ عشق میں کھل اُٹھے محبت کے گلاب
اب بھی خوشبو سے معطر ہے میرا حجلۂ جاں
اب بھی یادوں کے وہی پھول کھِلا کرتے ہیں
پھر کسی شہرِ سبا میں، مَیں پہنچ جاتی ہوں
آنکھ کھلتی ہے تو سب خواب بکھر جاتے ہیں
''خواب جب ٹوٹتے ہیں اور مزا دیتے ہیں''

گردِ سفر

مانگ میں چاند ستارے مری بھرنے والو!
میرے ماتھے پہ بہت گرد ہے پونچھو تو کبھی
ہاتھ ویران ہوں تو رنگِ حنا کیا معنی؟
ان لکیروں کے جزیرے سے نکالو تو کبھی
یہ لکیروں کے جزیرے بڑے ویران سے ہیں
میرے آنچل کا ہر اک رنگ ہی کچا ٹھہرا
بارشِ قلب ونظر جبکہ برس جاتی ہے
ہر اُمید، آس، تمنا سبھی ڈھے جاتے ہیں
آنکھ روتی ہے تو سب خواب بھی بہہ جاتے ہیں
زیست کے دشت میں سب چلتے چلے جاتے ہیں
اور ماتھے پہ مرے گرد جمی جاتی ہے

دشتِ غربت میں یادِ وطن آ گئی

مثلِ بادِ صبا یوں گزر جائیں گے
پھول ہی پھول ہر سو بکھر جائیں گے

تیری بنیاد میں خونِ اسلاف ہے
کیا تمناؤں کا خوں بہا معاف ہے
راستہ قافلے کے لیے صاف ہے
اے زمینِ وطن کیا یہ انصاف ہے

دشتِ غربت ہی میں کیا گزر جائیں گے
پھول ہی پھول ہر سو بکھر جائیں گے

شہر یارانِ ملک و وطن سوچ لو
علم و دانش کے سرو و سمن سوچ لو
تلخیِ زہرِ کام و دہن سوچ لو
حق کے مطلوبو دار و رسن سوچ لو

نعرۂ حق میں نیزوں پہ سر جائیں گے
پھول ہی پھول ہر سو بکھر جائیں گے

اے وطن نسل در نسل دیں گے خراج
زخمِ دل کا ترے ہم کریں گے علاج
تیری خاطر پہن لیں گے کانٹوں کا تاج
حق پرستی کا ہو تیری گلیوں میں راج

ظلم کے سارے دریا اتر جائیں گے
پھول ہی پھول ہر سو بکھر جائیں گے

ظلم کی آندھیاں اور برقِ تپاں
سامنے تیرے ٹھہرے نہ سیلِ رواں
ایسی عظمت کہ سجدہ کرے آسماں
عزمِ نو ساتھ لے کے بڑھے کارواں

روشنی ہم اندھیروں میں کر جائیں گے
پھول ہی پھول ہر سو بکھر جائیں گے

انا کی آگ

ساری یادیں
گروی رکھ کے
فکرو ذہن کا سودا کر کے
صرف انا کی خاطر اکثر
جذبے
سارے بِک جاتے ہیں

روحِ اقبالؒ سے تجدیدِ وفا کرنا ہے

اک ایسا دور بھی اس قوم نے گزارا تھا
شبِ سیاہ تھی ، نہ چاند تھا نہ تارا تھا
سفینہ ملتِ بیضا کا بے کنارا تھا
لباسِ فکر و عمل کتنا پارا پارا تھا

مثالِ ہاتفِ غیبی کی طرح کوئی اٹھا
سیہ افق سے طلوع آفتاب ہونے لگا

وہ آفتاب تھا اقبالؔ جو نہیں ڈوبا
جو اپنی قوم میں دن رات ہی ابھرتا رہا
خرد کے آئینے سے زنگ صاف ہونے لگا
پیامِ شاعرِ مشرق کا ہو گیا چرچا

مثالِ ابر وہ برسا تو رُت سہانی لگی
سروشِ غیب کی سی اس کی مہربانی لگی

تمھاری فکر کی پرواز کتنی اونچی تھی
تمھارے سازِ سخن سے حیات ملتی تھی
تمھارے حرف کی اک اک کلی مہکتی تھی
سکوتِ لالہ سے فطرت شناسی سیکھی تھی

جو تم نے ذوقِ سفر کارواں کو بخشا تھا
وہ کام تو کوئی واعظ بھی کر نہ پایا تھا

تمھارے سینۂ مضطر میں رازِ کن تھا نہاں
نگاہِ شوق سجائے تھی جلوۂ یزداں
خیال وخواب میں ہوتے نہیں زمان ومکاں
بس اپنی قوم کی الفت کا سوز دل میں تپاں

تمھاری بانگِ درا قافلے کی ہمت تھی
جگایا قوم کو جو مبتلائے غفلت تھی

تمھیں تھا قوم کا ہر فرد کس قدر پیارا
بدل کے رکھ دیا ملت کے بخت کا دھارا
جبینِ ناز پہ چمکا خودی کا اک تارا
بلند فکر سے کر دی تھی انجمن آرا

خدا سے شکوۂ مستانہ تیرا اچھا لگا
سنایا تو نے تو افسانہ تیرا اچھا لگا

وہ فکرِ سود و زیاں تو نے ہی عطا کی تھی
چراغِ عظمتِ رفتہ کی لَو بڑھائی تھی
ہر ایک جوہرِ مخفی کی رہنمائی تھی
تھکے ہوؤں کو نویدِ سفر سنائی تھی

ترے سخن نے پنپنے کے راز بتلائے
جہانِ تازہ میں انجم نئے نظر آئے

یہ تھا پیام کہ پیوستہِ شجر رہنا
تم اپنی راکھ میں خوابیدہ اک شرر رہنا
خود اپنی چشمِ تمنا میں نوحہ گر رہنا
طلسمِ ذات سے ہر آن باخبر رہنا

تمھاری جنتِ پنہاں تمھارے اندر ہے
درونِ ذات ہی سب کچھ ہے نہ کہ باہر ہے

الہ آباد میں خطبہ وہ باکمال دیا
وطن کا خواب دیا ملک کا خیال دیا
جناحؒ کی شکل میں رہبر وہ بے مثال دیا
کہ جس نے عارض و رخسار کو جمال دیا

بتایا ناقۂ لیلیٰ تلک پہنچنا ہے
ہر ایک راہ کے صحرا کو پار کرنا ہے

انھوں نے چاہا تھا ہوں نوجوان شاہیں صفت
اڑان جن کی چھوئے آسمان کی رفعت
عمل میں وہ ہوں مجسم قرآن کی سورت
علیؑ کا فقر تو بوذرؓ کی ان میں ہو طاقت

جو کوئی بولہبِ وقت ان سے ٹکرائے
تو ہاتھ ہی نہ بچیں ایسی وہ سزا پائے

حسین خواب کی تعبیر ہے ادھوری ابھی
نہ جانے قوم من و تو میں کیوں بھٹکنے لگی
ہے قصرِ شاہی کے ایوان تک نظر سب کی
مرے جوانوں میں شاہیں صفت نہیں کوئی

ہر آستیں میں چھپا خنجرِ عداوت ہے
اے میرے شاعرِ مشرق تری ضرورت ہے

میں اپنے شاعرِ مشرق کی قبر پہ جو گئی
اٹھا کے ہاتھ بس اک بار فاتحہ جو پڑھی
تو مجھ کو ایسا لگا روح مجھ سے گویا ہوئی
اے میری قوم کی بیٹی سنو صدا میری

دعا کرو کہ مِری روح کو قرار ملے
وطن میں امن رہے ملک کو وقار ملے

تمھارے خواب کی تعبیر کو خدا رکھے
وطن کے جذبۂ تعمیر کو خدا رکھے
ہمارے ملک کی توقیر کو خدا رکھے
جبینِ قوم کی تنویر کو خدا رکھے

پیامِ حضرتِ اقبالؒ نہ بھلا دینا
جنھوں نے خواب تھا دیکھا انھیں دعا دینا

کچا رنگ

ہرا بھرا سرخ پیلا
چمن کے سارے رنگ دلکش
مگر میں بیراگی رنگ اوڑھے
تمام رنگوں کو دور سے تک رہی ہوں

موسم کا رنگ

ان بے حس لوگوں کی دنیا میں
اپنی حس بھی کھو نہ بیٹھوں
لوگ یہ کہتے ہیں کہ اکثر
موسم کا رنگ چڑھ جاتا ہے

لفظوں کے مسیحا

دیارِ دل میں اک کچا مکاں تعمیر کرتے ہیں
یہ اپنا نام سطحِ آب پر تحریر کرتے ہیں
بھلا کیسے نہ پھر یہ ریختہ کی گفتگو بھائے
کہ شاعر درد کے طوفان کو تقطیر کرتے ہیں
شہر یارِ سخن ہوتے ہیں حرفوں کے شہنشاہ جو
دلِ مغموم کے ہر راز کی تشہیر کرتے ہیں
زمانے بھر کے سارے غم انھیں اپنے نظر آئیں
کتابِ درد کی یہ جا بجا تفسیر کرتے ہیں
یہ خوشبو کو مجسم کر کے اکثر پیش کرتے ہیں
شفق کو پیکرِ الفاظ میں تحریر کرتے ہیں
یہ رنگوں کے زبانِ حال سے ہیں واقف و محرم
گلوں کو، نور کو لفظوں سے یہ تصویر کرتے ہیں
تمنائیں کنیز اُن کی غلام ارمان ہیں اُن کے
یہ قرطاسِ ورق پہ اک محل تعمیر کرتے ہیں

منجمد فکر

سارے خیال تھک گئے
آتشِ فکر سرد ہے
اے میرے ذہنِ ناتواں
مجھ کو نئے خیال دے
فکر کی آگ سے نئے
شعلوں کو تو اُبھار دے

غزالاں تم تو واقف ہو

غزالاں تم تو واقف ہو بیاباں کے اجڑنے پر
کہو اس آنکھ کی ویرانیاں کیا کیا بتاتی ہیں

محبت کی زبانی ہجر کے پُر درد سے قصّے
وہ یادیں اس کی آنکھوں کی بھی کیا نیندیں اڑاتی ہیں

ہوا کے ایک اک جھونکے میں نالے ہیں محبت کے
وہ دل کی اَدھ کھلی کلیاں اسے کتنا ستاتی ہیں

غزالاں تم تو واقف ہو کہ مجنوں کیوں تڑپتا تھا
ذرا یہ بھی بتاؤ آنکھیں کیسے دکھ چھپاتی ہیں

غزالاں درد کی شدت کا گر احساس ہے تم کو
کبھی سوچو کہ کلیاں دکھ سے کیسے مسکراتی ہیں

غزالاں واقفِ آداب ہیں ہم بھی سمجھتے ہیں
بگولوں کی زبانی وحشتیں جو کچھ بتاتی ہیں

یہ چراغ بجھ نہ جائے

چراغ کی لو بھڑک رہی تھی
دِیا
توانائی کھو چکا تھا
ستارے
آسماں سے پلکوں پہ آ گئے تھے
وہ اعتماد کا ماہِ کامل
ہلال میں پھر بدل گیا تھا
مگر
اماوس کی رات کے خوف سے
میں نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا

چراغ میں سمجھوتے کی
مصلحت کا تیل ڈالے
خانہ جنگی کا باب
پڑھ رہی تھی
خانہ جنگی!!
خانہ جنگی تو خود کو کمزور کر کے
دشمن کو
قوی بنانے کی ایک خوبصورت چال ٹھہری
ذہین دشمن
میں کھوکھلی ہو چکی ہوں
سو میں
ہتھیار ڈالتی ہوں
صبح وہ
میری مجبوریوں کی لاش پر جشنِ فتح منا سکے گا

تنہائی

دل کو بہلایا ہے کس طرح تمھیں کیا معلوم
میں نے دیواروں سے تنہائی میں باتیں کی ہیں
ایسی تنہائی کہ سائے بھی مجسم تھے جہاں
خامشی مارگزیدہ کی طرح ڈستی تھی
گفتگو کرنے کا فن ہونٹ مرے بھول گئے
آنکھ پتھرا گئی دیواروں کو تکتے تکتے
زندگی پر مجھے شک ہونے لگا جس لمحے
دل نے سمجھایا کہ تنہائی ہے مونس تیری
یہی انسان کا آغاز ہے انجام یہی
اب تو یہ سوچتی ہوں ایسا نہ ہو جائے کہیں
مشقِ تنہائی مہارت کی سند بن جائے
تم جو آؤ تو ملاقات پہ دل گھبرائے !!

دلِ وحشی

تم طرب گاہوں کو آباد کرو شاد رہو
ہم تمھارے لیے ہر وقت دعا کرتے ہیں
وحشت انگیز ہے دل کا سفرِ سخت مگر
ان بگولوں سے کہیں پاؤں بھلا رکتے ہیں
ہم تمنائے محبت نہیں اے جانِ طرب
نزہتِ عشق میں گمنام جلا کرتے ہیں
عشق کا روگ ہے وہ روگ کوئی کیا سمجھے
سانس لیتے ہیں تو سولی پہ کھنچا کرتے ہیں
کشفِ احوال گوارا ہی نہیں ہے ہم کو
مرضِ عشق میں چُپ چاپ گُھلا کرتے ہیں

عشق تو نام ہے روحانی تمناؤں کا
جسم اور جان کو کیوں شاملِ دل کرتے ہیں
برزخِ ذات میں ہیں حشر کے امکاں کب سے
دار سے دار تلک کا یہ سفر ختم کرو
آ کے لے جاؤ وفاؤں کا جنازہ ہم سے
دل کے گمنام سے گوشے میں اسے دفن کرو
دلِ وحشی کی سزا یہ ہے کہ اس مجرم کو
دشت سے لا کے کسی شہر کا پابند کرو

سعیٔ ناکام

چند بے سود تمناؤں کو دامن میں لیے
آج کی رات بھی بے چین گزاری میں نے
کچھ سنہرے سے حسیں خوابوں کو آنکھوں میں لیے
بس اندھیرے کی رفاقت ہی سنواری میں نے
میرا ایوانِ تخیل بھی بڑا دلکش تھا
چند مبہم سے خیالات سجا رکھے تھے
اپنے افسانوں کو دلچسپ بنانے کے لیے
درد کے سینکڑوں طوفان چھپا رکھے تھے
فاصلے کم نہ ہوئے پاؤں مگر تھک سے گئے
سعیٔ ناکام پہ میں آج بھی شرمندہ ہوں
تم کو پایا نہیں یہ ایک حقیقت ہے مگر
خود کو کھونے پہ صنم آج بھی شرمندہ ہوں

خوبصورت افسانہ

ہمارا افسانہ
منتہا کو پہنچ چکا ہے
سو ہم بھی
اپنے عروجِ عشق کی نہج پر
چلو فسانہ ہی ختم کر دیں
کہ ذوقِ قرأت
تشفیٔ سماعت کے واسطے
ایک مختصر فسانہ
کہ جس کا انجام تشنگی ہو
سماعتوں کو سیرابی بخشتا ہے

ہم کبھی آئینے کی زینت تھے

اپنے ہر عکس سے اب آنکھ ہی بھر آتی ہے
فصلِ گل لے کے نکلتے تھے کبھی دوش پہ ہم
گلشنِ زیست کی رونق کا سبب ہوتے تھے
زلف جب شانے پہ اک بار جھٹک دیتے تھے
کتنے پیمانے تھے ہاتھوں سے جو گر جاتے تھے
لوگ کہتے تھے کہ گلشن میں بہار آئی ہے
آنکھ میخانے کی رونق کو بڑھا آئی ہے
اب یہ عالم ہے کہ پت جھڑ کے منادی بن کر
سارے گلشن کو بس آہوں سے سجا دیتے ہیں
ایسی تصویر کو آئینے مٹا دیتے ہیں
خشک پتوں کو فضاؤں میں اڑا دیتے ہیں
ہاں محل کا مگر کھنڈرات پتا دیتے ہیں
اب تو آئینے سے ہم آنکھ چرا لیتے ہیں

تعبیر کی منتظر آنکھیں

ہمیں امید ہے سورج ضرور نکلے گا
ہمیں یقین ہے یہ شب گزر ہی جائے گی
بہاریں اب نہیں آتی ہیں زرد پیڑوں پہ
ہوائیں روٹھ گئیں کیوں ہمارے گلشن سے
ہماری آنکھوں کو تعبیر کی ضرورت ہے
حسین خوابوں سے اب ہم بہل نہیں سکتے
ہر ایک پھول کا چہرہ ہے اترا اترا سا
ہر ایک غنچہ ہے سہا ہوا ہواؤں سے
پسِ نگاہ تمنائیں گریہ کرتی ہیں
انائیں اشکوں پہ پہرے لگایا کرتی ہیں
خدایا بادِ بہاراں کو بھیج دے تا کہ
کلی سے پھول بنے پھول سے ثمر نکلیں
اور اگلی فصل کے آثار پھر نظر آئیں
حسین وادی میں پھر چاندنی کا فرش بچھے
زمیں پہ پھر سے ستاروں کا قافلہ اترے

نسیمِ صبح کی نرمی ہو سب کے لہجے میں
سحر کی طرح سے چہرے پہ تابنا کی ہو
اسیرِ کنجِ قفس پھر اُڑیں فضاؤں میں
نئے گلابوں کی خوشبو ہو پھر ہواؤں میں
نئی سحر کے مناظر سہانے ہو جائیں
شبِ فراق کے قصّے فسانے ہو جائیں
ڈھلے جو دن تو شبِ عید ہو یا شامِ وصال
ہماری فکر کے خیمے بسے بسائے رہیں
خرد کے سر پہ جنوں کی رِدا سجائے رہیں
بس اب گماں کو یقیں میں بدل دے فصلِ بہار
خدا کرے کہ سلامت رہے ہر اک گلزار
نہ گھر جلے نہ جنازہ اُٹھے نہ دار سجے
ہر ایک حرفِ دعا میں خدا اثر دے دے
ہر ایک درد میں تاریخ یہ دکھاتی ہے
بہت طویل سہی شب، سحر بھی آتی ہے
عظیم طاقتیں منصف جو بن کے بیٹھی ہیں
انھیں پتہ نہیں مظلوم جیت جائے گا
یزیدِ وقت کو جا کر کوئی خبر کر دے
کہ نوکِ نیزہ پہ حق فیصلہ سنائے گا

شجرِ بے سایہ

جب تمھیں یاد کبھی آئیں تو اتنا کرنا
آسمانوں کی بلندی پہ نظر کر لینا
بس سمجھ لینا کہ انسان ہے مجبور بہت
اور اس شہرِ محبت میں ہیں منشور بہت
منصبِ عشق بھی تو خود ہی ملا کرتا ہے
شکلِ الہام میں پیغامِ وفا ملتا ہے
ہاں نبھانے کے لیے خونِ جگر چاہیے ہے
عشق میں دل ہی نہیں ساتھ میں سر چاہیے ہے
کم ہیں وہ لوگ: جو اس راہ سے زندہ لوٹے
صرف یوسفؑ ہی فقط چاہ سے زندہ لوٹے

ابنِ آذر سے بھلا آتشِ دل کم تو نہیں
ہم کو اس آگ میں جل جانے کا کچھ غم تو نہیں
گر خطاوار ہمیں ہیں تو پلٹ جائیں گے
اپنی احساس کی چادر میں سمٹ جائیں گے
اور گر ٹوٹ گیا دل تو یہ قسمت اپنی
آگے لے جاؤ نگاہوں سے محبت اپنی
ہم سمجھ لیں گے مسافت ہی فقط لکھی تھی
اپنی قسمت میں مشقت ہی فقط لکھی تھی
عشق کا پیڑ کبھی سایہ بھلا دیتا ہے!!
دل کو بس درد کا اک روگ لگا دیتا ہے

میرے ننھے پودے

میں شب و روز
اپنے باغ کے ننھے ننھے پودوں کی
دیکھ بھال میں لگی ہوں
میں ان کو اپنا لہو پلا کر
سیراب کر رہی ہوں
اپنے تمام جذبات کو تھپک کر
انھیں اہمیت دے رہی ہوں
مجھے یقین ہے میری یہ محنت
ضرور ایک نہ اک دن
مجھے میرے کیے کا پھل بھی دے گی!

ابھی میں ان کو سیراب کر رہی ہوں
یہ کل ضعف میں میری تشنگی کو بجھائیں گے
سہارا دیں گے عصا بنیں گے
جب عمر کی کٹھن دھوپ سر پہ ہوگی
یہی تو مجھ کو چھاؤں دیں گے
میرے یہ ننھے ننھے پودے
شجرِ سرسبز کی طرح پھلیں گے

مان گئے

مان گئے ہم جھوٹے تھے وہ سچا تھا
مان گئے یہ تنہائی کا سودا تھا

مان گئے ہم غلطی کی جو چاہا تھا
مان گئے دل غلطی پہ پچھتایا تھا

مان گئے یہ روگ اسی نے لگایا تھا
مان گئے وہی درد کا اپنے مداوا تھا

مان گئے کچھ دل کا ریشم الجھا تھا
مان گئے اسے سلجھانا بھی نہ آتا تھا

مان گئے کہ عشق کا حاصل کچھ بھی نہیں
مان گئے یہ دل نہ اپنا مانا تھا

مان گئے کہ ساری باتیں جھوٹی تھیں
مان گئے وہ صرف نظر کا دھوکا تھا

مان گئے بڑا مان تھا اس کے وعدے پہ
مان گئے کہ وعدہ تو پھر وعدہ تھا

قائد کے حضور احساسِ ندامت

بہت دنوں سے ہیں محروم دستِ شفقت سے
زمانہ بیت گیا ہم کو مسکرائے ہوئے
ہیں داغِ کینہ وفطرت جبین پر روشن
سبق بھلا دیئے سب آپ کے پڑھائے ہوئے
بہت دنوں سے بھٹکتا ہے کاروانِ وطن
ہے قوم گردشِ دوراں کے زخم کھائے ہوئے
مکان جو ہے ہمارا کبھی وہ گھر بھی بنے
یہ خواب رہ گئے آنکھوں میں ہم سجائے ہوئے
حضور آپ کے احسان کا ہو قرض ادا
اگر چراغِ محبت جلیں بجھائے ہوئے

ویران صنم خانہ

ریا کاری کا جال ہر سو بچھا ہوا ہے
عبادتیں
نیک نامی کا اشتہار بن کر رہ گئی ہیں
خلوص!! اس دورِ پرفریب میں
ایک جنسِ گراں کی صورت سے گم شدہ ہے
میرے خدا!
یہ کیسے عابد ہیں تیرے ہوتے
جو نام وانا اور منصب کے بت تراشے
خود اپنے آپ کو سجدہ کر رہے ہیں
میں کس کو پوجوں؟
کہاں میں جاؤں؟
مرا تو کوئی بت کدہ بھی نہیں ہے

مکالمہ

اس نے کہا تیری آنکھوں میں کیوں وحشت ہے
میں نے کہا یہ وحشت میری قسمت ہے

اس نے کہا اس عمر میں لڑکیاں ہنستی ہیں
میں نے کہا یہ اپنی اپنی قسمت ہے

اس نے کہا کیوں صحرا تجھ میں اترا ہے
میں نے کہا ہر شے کا آخر ہجرت ہے

اس نے کہا تو کس کو ڈھونڈتی رہتی ہے
میں نے کہا کہ خود سے بچھڑ کے یہ حالت ہے

اس نے کہا کیوں زلفیں بکھری رہتی ہیں
میں نے کہا کب سُلجھانے کی فرصت ہے

اس نے کہا کیوں خالی کلائی ہے تیری
میں نے کہا بس شور سے مجھ کو نفرت ہے

اس نے کہا ماتھے پہ تلک لگا سجنی
میں نے کہا بن چھاپ ہی میری شہرت ہے

اس نے کہا آنکھوں میں کجرا سجا تو کبھی
میں نے کہا آنکھوں میں سمائی حیرت ہے

اس نے کہا آنچل بھی تیرا شوخ نہیں
میں نے کہا اس سادگی میں بھی شرارت ہے

اس نے کہا سچ بولنا چھوڑ دے تو پگلی
میں نے کہا مجھے خود بھی اس پہ ندامت ہے

اس نے کہا اب کچھ نہ تجھے سمجھاؤں گا
میں نے کہا بڑی آپ کی مجھ پہ عنایت ہے

شکستہ دل کی دعا

سلیم جعفری کے انتقال سے چند سال پہلے کی نظم

بہت بے چین اور بیمار ہو تم
خدا جلدی شفائے کاملہ دے

مرض تم کو جو لاحق ہو گیا ہے
ہر اک لمحہ کوئی دھڑکا لگا ہے

میں ہوں اک شاعرہ اور پاس میرے
تمھارے واسطے حرفِ دعا ہے

سلیمؔ اس دور بے مہری میں لیکن
شکستہ دل دعاؤں سے بھرا ہے

مرے بیمارِ غم صحت تمھیں ہو
خدا سے بس یہی اک التجا ہے

تمھارے زرد سے چہرے پہ پھر سے
ہرا موسم اترنا چاہتا ہے

تمھاری نرگسی آنکھوں میں پھر سے
ضیا پاشی کا ساماں ہو رہا ہے

تمھیں جانے کی جلدی کس لیے ہے
شجر پہ اب ثمر آنے لگا ہے

دعا سے بدگماں مجھ کو نہ کرنا
قبول ہونے کا سارا مرحلہ ہے

نہیں تو بے یقینی کی فضا میں
نظر کی آخری حد تک خلا ہے

خلاؤں کا سفر کتنا کٹھن ہے
جہاں سب کچھ خرد سے ماورا ہے

دعا ہی تو یقیں کا مرحلہ ہے
مسیحائی کا جادو دیکھنا ہے

انتقال کے بعد کے تاثرات

نہ عیسیٰؑ ہے نہ کوئی معجزہ ہے
اثر باقی دوا میں کچھ نہیں ہے

امید و یاس کا بکھرا گھروندا
مرے دستِ دعا میں کچھ نہیں ہے

رہے گا صرف اک اللہ باقی
تقاضائے بقا میں کچھ نہیں ہے

تماشا

انتساب

اپنے عزیز ترین ماموں ڈاکٹر وراثت شکُوہ کشمیری

کے نام

جو سائنس اور علم وادب کا روشن ستارہ تھے

راز کا بزم میں چرچا کبھی ہونے نہ دیا
ہم نے اپنے کو تماشا کبھی ہونے نہ دیا

ہم کو اس گردشِ دوراں نے کہیں کا نہ رکھا
پھر بھی لہجے کو شکستہ کبھی ہونے نہ دیا

میکدے میں بڑے کم ظرف تھے پینے والے
آنکھ کو ساغر و مینا کبھی ہونے نہ دیا

کتنا آسان تھا اپنے سے جُدا ہو جانا
عشق میں ذہن کا سودا کبھی ہونے نہ دیا

روز جلنا ہے اسے روز جلانا ہے اسے
آتشِ شوق کو ٹھنڈا کبھی ہونے نہ دیا

عمر رشتوں کے تقاضے ہی نبھاتے گزری
زندگی نے مجھے اپنا کبھی ہونے نہ دیا

سب سے محفوظ مقامِ غمِ تنہائی ہے
فکرِ دنیا نے اکیلا کبھی ہونے نہ دیا

ابھی دعویٰ محبت کا نہ کرنا
ابھی میں نے تمھیں پرکھا نہیں ہے

❁

چشمِ احساس سے ٹپکا ہوا آنسو میں ہوں
تو ہے گر پھول تو پھر پھول کی خوشبو میں ہوں

کس قدر مجھ سے گریزاں ہے یہ وحشت میری
دشتِ تنہائی میں بھٹکا ہوا آہو میں ہوں

مجھ میں تہذیب و تمدن کا خزانہ ہے نہاں
یوں گریزاں نہ ہو مجھ سے تری اُردو میں ہوں

کب تلک کرتا رہے گا میری ہستی کی نفی
تو قوی جسم ہے اور قوتِ بازو میں ہوں

خامشی سے مری رک جائے گی یہ نبضِ حیات
اور لب کھولے تو اک نعرۂ باہو میں ہوں

آج پھر آنکھ میری بھر آئی
ہائے پیمانۂ شکیبائی

اس سے بہتر تھی میری تنہائی
زخم دینے لگی شناسائی

عصر تک کام آ گیا بھائی
شام کو یاد اک بہن آئی

ہے تماشے کا اختتام یہی
جب تماشا بنے تماشائی

اک اذاں اور نماز کا وقفہ
زندگی کتنی مختصر پائی!

آ گہی کا عذاب جھیلا ہے
ہائے کیا ہے یہ رمزِ دانائی

بند کمروں میں ہو رہی ہے گھٹن
کیا ہوئی گھر کی میرے انگنائی

ڈار سے کونج جبکہ بچھڑی تھی
اوّل اوّل بہت وہ گھبرائی

قلب کا نور گر نہیں دیتا
چھین لے آنکھ کی بھی بینائی

وسعتِ دشت تو ملی نہ کبھی
آئی حصے میں آبلہ پائی

پھول کھل کے بکھر گیا تو لگا
اک کہانی کسی نے دہرائی

اب خوشی میں کوئی خوشی نہ رہی
زندگی جیسے زندگی نہ رہی

مجھ کو بھی ناز ہو گیا خود پر
مجھ میں بھی دوست عاجزی نہ رہی

ہجر سے بڑھ کے یہ عذاب ہوا
آرزوئے وصال بھی نہ رہی

تو نے غم سہہ لیا جدائی کا
آنکھ میری بھی شبنمی نہ رہی

اُس کی باتوں میں اب کہاں جادو
مجھ میں بھی کوئی دلکشی نہ رہی

پوری کوئی بھی تمنا نہیں ہونے دیتے
لوگ مجھ کو مرا اپنا نہیں ہونے دیتے

دلِ منکر کو بھٹکنے نہیں دیتے یہ صنم
ایک بت خانہ کو کعبہ نہیں ہونے دیتے

رُخ نہیں کرتے کسی راہنما کی جانب
وہ تو قبلے کو بھی قبلہ نہیں ہونے دیتے

دیدۂ شوق تو آمادہ رہا ہے ہر دم
ہم کبھی خود کو تماشا نہیں ہونے دیتے

رابطہ اپنے مسیحا سے رہے اس خاطر
اپنے بیمار کو اچھا نہیں ہونے دیتے

❁

جنوں ہی آگہی کی انتہا ہے
یہاں سب کچھ خرد سے ماورا ہے

بہت شرمندہ ہونٹوں پر دعا ہے
دیا بھڑکا ، جلا ، پھر بجھ گیا ہے

گلی کوچوں میں اک مقتل سجا ہے
جدھر دیکھو اُدھر اک کربلا ہے

میں ہر رُخ سے سلامت لگ رہی ہوں
وہ ٹوٹا ہے مگر اک آئینہ ہے

جو میری آستیں میں پل رہے تھے
اُنہی سانپوں نے مجھ کو ڈس لیا ہے

ذرا اُس کو کہیں سے ڈھونڈ لاؤ
فضاؤں میں جو نغمہ کھو گیا ہے

چند تنکے ہی گلستان میں رہنے دیتے
تم دعا کے مجھے امکان میں رہنے دیتے

ایک دو تار گریبان میں رہنے دیتے
کاش مجنوں! کو بیابان میں رہنے دیتے

کشتیِ دل مری طوفان میں رہنے دیتے
اس تجارت میں تو نقصان میں رہنے دیتے

بستیوں میں تھی اگر امن کی خواہش تم کو
فوج کو جنگ کے میدان میں رہنے دیتے

غنچۂ دل نہ کھِلا سکتے تو اتنا کرتے
سوکھے پھولوں کو ہی گلدان میں رہنے دیتے

کعبۂ دل کو صنم خانہ بنانے والے
کچھ عقیدے مرے ایمان میں رہنے دیتے

خود شناسی کے طلسمات سے تو بہتر تھا
مجھ کو پریوں کے شبستان میں رہنے دیتے

کل میں دعائے نیم شبی کر کے جب اُٹھی
میری ہتھیلیوں کے جزیرے سُلگ اُٹھے

پتّے پتّے پر ہے شبنم
بزمِ گل ہے بزمِ ماتم

چوٹ لگے جب کوئی پیہم
زخم ہی بن جاتا ہے مرہم

جل کر خاک ہوا پروانہ
چشمِ شمع ہو گئی پُرنم

عشق ہے مثلِ دستِ عیسیٰ
حُسن کی صورت جیسے مریم

گردشِ دوراں کا کیا رونا
گردش میں ہے سارا عالم

کیسے ملے تسنیمؔ سکوں اب
دل کا نظام ہے درہم برہم

مصحفِ سادہ کے مفہوم کی سورت وہ ہے
اور فرمانِ تمنا کی مصنّف میں ہوں

زندگی جینے کا انداز نیا مانگے ہے
سانس لینے کے لیے تازہ ہوا مانگے ہے

مانگنے والا بھی مانگے ہے تو کیا مانگے ہے
مجھ کو ہر آن وہ مجھ سے ہی جُدا مانگے ہے

زندگی بھر کی رفاقت کی ضرورت کیا ہے
پھول اک جھونکا ترا بادِ صبا مانگے ہے

زندگی نام ہی جس شخص کے ہم کر بیٹھے
اب وہی ترکِ تعلق کی دعا مانگے ہے

دلِ نادان کی خوش فہمی کا عالم دیکھیں
اور تو کچھ نہیں تھوڑی سے وفا مانگے ہے

زندگی جبرِ مسلسل میں ہے گزری اپنی
زہر بن جائے جو، اب ایسی دوا مانگے ہے

جرم و انصاف عدالت کے لیے
ایک مجرم کی ضرورت ہے بہت

چراغِ فکر مِری تیرگی نہیں جاتی
لبِ فرات بھی اب تشنگی نہیں جاتی

اُسے میں اس کی طرح سے جواب دے نہ سکی
مرے مزاج سے شائستگی نہیں جاتی

حصارِ ذات سے نکلی تو کائنات ملی
عجیب ہوں میری آوارگی نہیں جاتی

ہیں میرے ساتھ کے سب لوگ کتنے آسودہ
مرے ہی گھر کبھی آسودگی نہیں جاتی

ہزار چاک گریباں رفو کرے کوئی
سروں سے عشق کی دیوانگی نہیں جاتی

سارے عالم میں انتخاب کیا
میری مٹی کو پھر خراب کیا

میں مجسم سوال تھی لیکن
اس نے مجھ کو بھی لاجواب کیا

اس سخی سے کیا ہے میں نے طلب
جس نے ذرّے کو آفتاب کیا

کر لیا اکتفائے ناکامی
کس سخاوت سے کامیاب کیا

اپنا ہونا بھی نہ ہونے کے برابر ٹھہرا
گردشِ وقت رُکی جب میرا ساغر ٹھہرا

کیا گلہ تم سے کریں تم نہیں رُک پائے اگر
جب میری آنکھ کا آنسو بھی نہ پل بھر ٹھہرا

ایک طوفانِ تلاطم ہے تمناؤں کا
ایسا لگتا ہے کہ دل میں کوئی خود سر ٹھہرا

شرم سے ڈوب گیا مہرِ منور آخر
نوکِ نیزہ پہ چمکتا جو کوئی سر ٹھہرا

ہر قدم پر ہو رہا ہے امتحانِ آرزو
رُک نہ جائے تھک کے میرا کاروانِ آرزو

دل کی دھڑکن کہہ رہی ہے داستانِ زندگی
سن نہ لے کوئی کہیں میری زبانِ آرزو

دشتِ حسرت اور تمناؤں کا اک اُجڑا سراب
کس قدر ویران ہے میرا جہانِ آرزو

دل کی حالت کا بتانا تھا بہت دشوار جب
آنکھ کا آنسو بنا پھر ترجمانِ آرزو

ایک دیوانے پہ جو ویرانے میں گزری کبھی
اب بگولے بن گئے ہیں قِصّہ خوانِ آرزو

دل نشانے پہ لیے یہ سوچتے ہیں آج بھی
اور کتنے تیر باقی ہیں کمانِ آرزو

کیوں ترے کُن کا اثر ہو نہ سکا ہے مجھ پہ
اے خدا اب تو مجھے چاک پہ پیالہ کر دے

زخمِ تمنا کام کا نکلا
دشمنِ جاں آرام کا نکلا

سورج کی لو بجھ جانے پر
ایک ستارہ شام کا نکلا

خوشبو اپنے ساتھ اُٹھائے
قافلہ اک گلفام کا نکلا

سسی ، سوہنی ، شیریں ، لیلیٰ
اب کے قرعہ مرے نام کا نکلا

ٹوٹ کے کیوں چاہا تھا میں نے
یہ پہلو الزام کا نکلا

یوسف ہے بازار میں شاداں
سودا اُس کے دام کا نکلا

مٹھی بھر خاک اور اک کتبہ
زندگی بھر کا یہ خلاصہ ہے!!

راہِ عشق میں کام جو کوئی کر جاتی
زندہ رہنے کی خاطر میں مر جاتی

صحرا ، شام کا سنّاٹا اور تنہائی
سورج ڈوبتا جب، میں اپنے گھر جاتی

خونِ ناحق صحرا ہی میں چھپ جاتا
کیا ہوتی تشہیر اگر میں ڈر جاتی

کچھ نہ کچھ تو ظلمتِ شب میں ہوتی کمی
طاقِ دل پہ ایک چراغ ہی دھر جاتی

اتنی مہلت تو دیتے یہ کام مجھے
اس کے آنے سے پہلے میں سنور جاتی

مرے اندر جو پھیلی روشنی ہے
نگاہوں سے وہ اکثر جھانکتی ہے

نمی آنکھوں میں بے وجہ نہیں ہے
مِرے دریا میں طغیانی بہت ہے

نہیں میں معتبر اپنی نظر میں
عجب طرح کا کربِ آگہی ہے

میں اپنے سے بچھڑ کر جی رہی ہوں
مری تنہائی مجھ پر رو رہی ہے

ابھی تک یہ نہیں آیا سمجھ میں
کہ اپنی زندگی میں کیا کمی ہے

کسی تشنہ دہن کے بعد ہم نے
بھرے دریا کی دیکھی تشنگی ہے

ہر اک تعمیر میں تخریب مضمر
اُجڑنے کے لیے بستی بسی ہے

❁

میں اُسے ایک فسانے کی طرح پڑھتی رہی
وہ مجھے ایک کہانی کی طرح کہتا رہا

آپ ہیں کتنے حیلہ جو صاحب
آج ہو جائے دو بدو صاحب

آئینے کی ہے گفتگو صاحب
ایک پتھر کے روبرو صاحب

حق کی قسمت لہو لہو صاحب
وہی خنجر وہی گلو صاحب

ہم سے مِلیے ہیں دوستی کی سند
اِن سے مِلیے یہ ہیں عدو صاحب

دامنِ تر زمانہ دیکھا کیا
آپ کرتے رہے وضو صاحب

کیا کوئی خاک ہم کمال کریں
خاک میں ہو گی کیا نمو صاحب

تصفیہ گھر کا گھر میں رہنے دیں
بات پھیلے گی کو بہ کو صاحب

❁

ترقی کا سبب ہے خود شناسی
تنزل کی وجہ ہے خود ستائی

خلا ہے مجھ میں ، کچھ اندر نہیں ہے
مگر کچھ خاک کے باہر نہیں ہے

وہی ہیں چاک پر گردش میں عنصر
ہُنر میں دستِ کوزہ گر نہیں ہے

اُترنے میں زمیں پہ بندگی تھی
غرور اے آسماں بہتر نہیں ہے

ہے گھر داری مِری فطرت میں لیکن
مِرا اپنا کوئی بھی گھر نہیں ہے

رواں ہے زخمِ سر سے خون لیکن
کسی بھی ہاتھ میں پتھر نہیں ہے

مصلحت کوشی کی زحمت پہ نہ مجبور کرے
وہ ہمیں جرمِ سیاست پہ نہ مجبور کرے

اس زیاں کار تجارت پہ نہ مجبور کرے
دل کسی سے بھی محبت پہ نہ مجبور کرے

سر کٹانے کی سعادت پہ نہ مجبور کرے
پھر یہ کوفہ کسی بیعت پہ نہ مجبور کرے

روح ہے مائلِ پرواز تو یہ جسم اسے
ایک مٹی کی عمارت پہ نہ مجبور کرے

سوچتی ہوں میں کہیں پاؤں کا چکر مجھ کو
پھر کسی شہر کی ہجرت پہ نہ مجبور کرے

جنوں پیمائی بڑھتی جا رہی ہے
مری دانائی بڑھتی جا رہی ہے

خریدارِ وفا ہوں بک نہ جاؤں
بہت مہنگائی بڑھتی جا رہی ہے

یہ کیسے ہیں مراسم اُس سے میرے
مری تنہائی بڑھتی جا رہی ہے

بہت سر میں تھا زعمِ پارسائی
اور اب رسوائی بڑھتی جا رہی ہے

مرا قد گھٹ گیا حلقے میں اس کے
مگر سچائی بڑھتی جا رہی ہے

شعور و آگہی نے کیا دیا ہے
بس اِک بینائی بڑھتی جارہی ہے

تجلی تھی جلوہ تھا کہ نگاہوں کا امتحاں
ہے بابِ چشمِ شوق جو حیران آج تک

مصلحت کو مری پسپائی نہ سمجھا جائے
میرے دشمن کو مرا بھائی نہ سمجھا جائے

سر جو نیزوں پہ فروزاں ہیں وہ ہیں ساتھ مرے
میری تنہائی کو تنہائی نہ سمجھا جائے

سرِ بازار خریدار بھی بکتے دیکھے
پھر بھی مہنگائی کو مہنگائی نہ سمجھا جائے

قالبِ شعر میں ہر غم کو سمونا ہے تو پھر
شعر کو قافیہ پیمائی نہ سمجھا جائے

زہر ہے آج فقط پیاس بجھانے کی دوا
جھوٹ کو وقت کی سچائی نہ سمجھا جائے

عشق میں نام ونسب داؤ پہ لگ جاتا ہے
اس میں رسوائی کو رسوائی نہ سمجھا جائے

جس نے تسنیم جلائے ہیں بناوٹ کے چراغ
اُس کی رعنائی کو رعنائی نہ سمجھا جائے

❁

جبینِ ناز ہے سجدوں سے روشن
دلوں میں بُت مگر اب تک سجے ہیں

کلی کھلانے کو بادِ صبا ضروری ہے
نمو کے واسطے آب و ہوا ضروری ہے

یہ کہہ کے اُس نے بتائی تھی اہمیت اپنی
تمھارے عکس کو اک آئینہ ضروری ہے

جو خاص بات تھی بین السطور میں نہ لکھی
کتابِ عشق میں اک حاشیہ ضروری ہے

ہر ایک جرم کی معافی ریاستِ دل میں
جو بے وفا ہو تو اُس کی سزا ضروری ہے

نجانے کون سے اسرار کھلنے لگ جائیں
اسی لیے تو ذرا فاصلہ ضروری ہے

نظر حیران ہے کیا ہو رہا ہے
تماشے پر تماشا ہو رہا ہے

ہمیشہ بعد میں کھلتا ہے ہم پر
ہمارے ساتھ دھوکا ہو رہا ہے

مرے ہاتھوں سے ہر لمحہ بکھر کر
حقیقت سے فسانہ ہو رہا ہے

بہت مشکل تھا ہم کو ختم کرنا
مگر اب رفتہ رفتہ ہو رہا ہے

مکافاتِ عمل سوچا نہ تم نے
جو ہونا چاہیے تھا ہو رہا ہے

ہم اپنے آپ کو یاد آ رہے ہیں
وجود اپنا پرایا ہو رہا ہے

زلیخا سے کہو بولی لگائے
یہاں یوسفؑ کا سودا ہو رہا ہے

سیاست کے لیے اس مملکت میں
ہر اک قاتل مسیحا ہو رہا ہے

ترے مسحور تو ہیں گنگ بیٹھے
ترے جادو کا چرچا ہو رہا ہے

چلو تسنیمؔ گھر کو لوٹ جائیں
بہت گہرا اندھیرا ہو رہا ہے

کیا گلہ ہے وجود ہو کہ عدم
اپنی دنیا نہ یہ ، نہ وہ عالم

دوست، ساتھی ، رفیق اور ہمدم
چھوڑ جاتے ہیں جب ہو شامِ غم

اس کے بازو میں چاہیے دم خم
قافلے کا اٹھائے جو پرچم

عشق کے بے اثر سبق سارے
تم تو تم ہی رہے اور ہم بھی ہم

خود سے سارے جواب ملنا ہیں
کچھ نہیں دیں گے تجھ کو دیر و حرم

❁

چاک دل کے کبھی سلے ہوتے
جن سے ملنا تھا وہ ملے ہوتے

یوں تو سارا چمن مہکتا تھا
پھول کھلنے تھے جو کھلے ہوتے

کہکشاں راستے میں بجھ جاتی
شب سے گزرے جو قافلے ہوتے

موم کی طرح ہم ڈھلے لیکن
پتھرو ! تم بھی تو ہلے ہوتے

خامشی کی زباں سمجھ لیتے
عشق میں ایسے سلسلے ہوتے

دل جو کہتا وہ دل ہی سن لیتا
اس طرح بھی کبھی گلے ہوتے

اک یقیں تھا ، گماں میں نہ رہا
تیر جیسے کماں میں نہ رہا

ایسی تنہائی ہے کہ سوچتے ہیں
کیا کوئی خاندان میں نہ رہا

پڑھتے رہیے نمازِ خوف کہ اب
کوئی امن و امان میں نہ رہا

اُس کے جانے کے بعد ایسا تھا
جیسے کوئی جہان میں نہ رہا

کوچ کرنا پڑا تو سوچتے ہیں
لوٹ جانا دھیان میں نہ رہا

مجھے عروج نہیں ہے اُسے زوال نہیں
وہ بے بسی ہے کہ جس کی کوئی مثال نہیں

جواب روز دیئے جا رہے ہیں اِس جانب
اور اُس طرف سے ابھی تک کوئی سوال نہیں

کہاں کا ہجر کہاں کا وصال ، باتیں ہیں
یہاں کسی کو کسی کا ذرا خیال نہیں

وہ جب تھا پاس تو اندیشۂ جدائی تھا
بچھڑ گیا ہے تو اب کوئی بھی ملال نہیں

بساطِ فن پہ مصوّر نہ کھینچ صورت کو
ہمارے عکس میں پہلا سا اب جمال نہیں

تمھارے تیر نشانے پہ کس طرح نہ لگیں
ہے دل ہتھیلی پہ ہاتھوں میں کوئی ڈھال نہیں

کچھ یقیں تو گماں میں رکھتے
مجھ کو یوں امتحان میں رکھتے

اس عدم اور وجود کی خاطر
خاک ہی بس نشان میں رکھتے

ہم زباں جانتے شکایت کی
خامشی تم بیان میں رکھتے

وصل میں ہی بچھڑ گئے ہوتے
ہجر کو گر دھیان میں رکھتے

ہجر میں بھی گزر بسر کے لیے
اس کی خوشبو مکان میں رکھتے

فیصلے کی گھڑی میں ہم دونوں
خود کو نہ درمیان میں رکھتے

جس کا لشکر ہی گھیر لے اس کو
وہ عدو خاندان میں رکھتے

❁

رات کٹنے کے لیے تازہ نشانی نہ رہی
زندگی کی کوئی اب زندہ نشانی نہ رہی

سوچا نہیں گیا ، مجھے سمجھا نہیں گیا
تاریخ میں کبھی مجھے لکھا نہیں گیا

میرے ہنر میں عیب نظر آئے اس لیے
معیار پر کبھی مجھے پرکھا نہیں گیا

میں اپنے حق کے واسطے تنہا کھڑی رہی
میزانِ عدل پر مجھے تولا نہیں گیا

غیرت کے نام پہ کبھی حرمت کے نام پہ
بکتی رہی ، زمانے میں بِکنا نہیں گیا

میرے لیے سزا یہی تجویز کی گئی
زندہ رکھا گیا مجھے مارا نہیں گیا

جنگوں میں تھی میں مالِ غنیمت کے طور پر
میرے لیے کبھی مجھے بانٹا نہیں گیا

ہم وہ کردارِ محبت ہیں تمھیں کیا معلوم
داستانوں میں جو ملتے ہیں یا افسانوں میں

چشم و لب، ابرو و رخسار لیے پھرتے ہیں
بیچنے کے لیے بازار لیے پھرتے ہیں

اپنی زنجیر کی جھنکار لیے پھرتے ہیں
دیکھ ہم وقت کی رفتار لیے پھرتے ہیں

سر لیے پھرتے ہیں دستار لیے پھرتے ہیں
لوگ قاتل تیری تلوار لیے پھرتے ہیں

اپنی قیمت کا بس اندازہ لگانے کے لیے
کتنے خوش فہم ہیں کردار لیے پھرتے ہیں

کچھ ذرا ٹھہر تمنائے چراغِ ہستی
آنکھ میں حسرتِ دیدار لیے پھرتے ہیں

زخم اب پیشِ نمائش ہیں تجارت کی طرح
اپنی تشہیر کو غمخوار لیے پھرتے ہیں

خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو پاتے
خواب میں طالعٔ بیدار لیے پھرتے ہیں

تشنہ لبی کو چہرے سے پہچانتے نہیں !!
ساقی تجھے پتہ ہے کہ ہم مانگتے نہیں

اس بار ہوا کُن کا اثر اور طرح کا
اس بار ہے امکانِ بشر اور طرح کا

اس بار نہ اسباب نہ چادر پہ نظر تھی
اس بار تھا لُٹنے کا خطر اور طرح کا

اس بار مدینے ہی میں در آیا تھا کوفہ
اس بار کیا ہم نے سفر اور طرح کا

اس بار کوئی عیب کوئی عیب نہیں تھا
اس بار پسند آیا ہُنر اور طرح کا

اس بار کوئی خیر کا طالب ہی نہیں تھا
اس بار تھا اندیشۂ شر اور طرح کا

اس بار چلی بادِ سموم اور طرح کی
اس بار کھِلا ہے گلِ تر اور طرح کا

اس بار تو جبریلِ معانی کو ملا اِذن
اس بار جلا لفظ کا پر اور طرح کا

تعیّن سرحدوں کا کون کرتا
یہاں ہر مسئلہ حد سے سوا ہے

شامِ تنہائی نے یہ حشر اٹھایا کیوں تھا
خیمۂ دل کی طنابوں کو جلایا کیوں تھا

خونِ ناحق مرا مٹی میں ملانے والو!
سر سوالی ہے کہ نیزے پہ چڑھایا کیوں تھا

شہرِ ناپُرساں کی گلیوں میں پھری ہوں تنہا
کوفۂ عصر میں ہر شخص پرایا کیوں تھا

اُس رفوگر کی ہُنر مندی کا چرچا سن کے
دل صدا دینے لگا مجھ کو بُھلایا کیوں تھا

اُس کی مٹی میں تھی آشفتہ مزاجی شامل
پھر اُسے خاک کی مسند پہ بٹھایا کیوں تھا

آبیاری ہی نہ ممکن ہو جہاں پر تسنیم
پھر شجر ایسا ارادوں کا لگایا کیوں تھا

اب کوئی اور ہی پھل ہے جسے چکھنا ہے مجھے
اب کسی اور ہی جانب مری ہجرت ہو گی

لٹ گئی ہے دکانِ وفا ان دنوں عشق کندن نہیں ہے مسِ خام ہے
آ زمانے سے کچھ بھی نہ حاصل ہوا میں بھی نا کام ہوں تو بھی نا کام ہے

دائرے کے سفر کے مسافر بنے مسئلے اپنے قدموں سے لپٹے رہے
کیسے ساقی کریں تشنگی کا گِلہ بزم میں تیری جب گردشِ جام ہے

کلیاں کھلنے کی بس منتظر ہی رہیں اور شاخِ تمنا ہری نہ ہوئی
جس کی صبح ابھی تک نہیں ہوسکی ایک مدت سے سر پر وہی شام ہے

زندگی کے ملال میں گم ہیں
گردشِ ماہ و سال میں گم ہیں

عشق بھی میرؔ جیسا عشق کہ اب
اُس کے خواب و خیال میں گم ہیں

جنتِ وصل کا مزا چکھ کے
ہجر کے ہم وبال میں گم ہیں

جس کی کوئی مثال مل نہ سکے
ہم اُسی بے مثال میں گم ہیں

دے دیئے تھے سبھی جواب مگر
آخری اک سوال میں گم ہیں

ایک ہی لمحہ تو ہوتا ہے فیصلے کا
دستک دینے اور دروازہ کھلنے میں

مجھے دیکھو ، سنو اور یاد رکھو
میں اپنی ذات میں اک واقعہ ہوں

قطعات

اپنی تہذیب کا نشان ہیں ہم
اے زمیں تیرا آسمان ہیں ہم
دوسرا کوئی ہو نہیں سکتا
دل کے اور اپنے درمیان ہیں ہم

❁

اتنے لوگوں میں بھی میں ہوں میری تنہائی ہے
جانے کن موسموں کا دل یہ تمنائی ہے
آگے بڑھتی ہوں تو پندارِ اَنا ٹوٹتا ہے
پیچھے ہٹ جانے میں کچھ اور بھی رسوائی ہے

ہو گا یوں جشنِ بہاراں ہمیں معلوم نہ تھا
گھر ہمارا ہی جلے گا ہمیں معلوم نہ تھا
آگ بھڑکے گی جلے گی یونہی گھر کی میرے
ہم سلگتے ہی رہیں گے ہمیں معلوم نہ تھا

حسنِ خوبی سے نبھانا چاہتے ہو تم اگر
دوستی میں بھی ذرا اک فاصلہ رکھا کرو
جانے کب تنہائیاں تم کو سکوں لینے نہ دیں
ترکِ الفت میں بھی کوئی مشغلہ رکھا کرو

چراغِ وصل کسی طور جل ہی جائے گا
فراق و ہجر کا سورج ہے ڈھل ہی جائے گا
اگر ہے نخلِ تمنا خزاں رسیدہ تو
بہار آئے گی موسم بدل ہی جائے گا

سارا جہان قبلہ و کعبہ کہے جنھیں
وہ ڈھنگ سے ادا کوئی کلمہ نہ کر سکے
حیراں ہوں ہو رہے ہیں مشرف بہ شاعری
موزوں جو آج تک کوئی مصرعہ نہ کر سکے

خزاں نے شکل بدل ڈالی سارے باغوں کی
یہ ضَو فشانی کرامت ہے دل کے داغوں کی
دعا کرو کہ سلامت رہے دیا میرا
ہوا تلاش میں نکلی ہے پھر چراغوں کی

ہمیں تقسیم کر دیتے ہیں ہم کو توڑ دیتے ہیں
ہماری سوچ کے دھاروں کو اکثر موڑ دیتے ہیں
اگر سمجھوتے کے امکان سب معدوم ہو جائیں
پھر الزامات سے رشتہ ہمارا جوڑ دیتے ہیں

بدگماں فضاؤں میں عشق کی یہ صورت ہے
صاف دل نہیں ہوتے جانے کیا کدورت ہے
سب یقین کے تارے آج بجھتے جاتے ہیں!
اعتبار کے سورج اب تری ضرورت ہے

خاک کو خاک کے بستر کے سوا کچھ نہ ملا
فکر کو خواب کے منظر کے سوا کچھ نہ ملا
خلوتِ ذات میں اس طرح گرفتار ہوئی
بزم میں اپنے ہی پیکر کے سوا کچھ نہ ملا

سیاہ راتوں کو جب بے چینیوں میں کاٹ دیتے ہیں
تو پھر جا کر کہیں ہم کو سنہری حرف ملتا ہے
عطا کے در کھلے ہیں لیکن اتنا جان لینا تم
وہاں جو کچھ بھی ملتا ہے بقدرِ ظرف ملتا ہے

❁

فسانے حرف ہوتے جا رہے ہیں
یہ جذ بے برف ہوتے جا رہے ہیں
ضرورت بڑھ رہی ہے رفتہ رفتہ
مگر ہم صرف ہوتے جا رہے ہیں

❁

کسی کی یاد کی شبنم سے جب وضو ہو گا
تفکرات کا چہرہ ضرور نکھرے گا
میں پھول پھول میں خوشبو کی طرح پھیلوں گی
وہ رنگ بن کے مرے ساتھ بکھرے گا

❁

دل میں دلکش سی ہوک اٹھتی ہے
جیسے کوئل کی کُوک ہوتی ہے
یہ فرشتہ نہیں ہے انساں ہے
آدمی ہی سے چُوک ہوتی ہے

وہ یادِ ماضی کا ہر سلسلہ ہے تابندہ
کتابِ زیست کا اک ایک باب رخشندہ
تمام شہر کے ہاتھوں میں اب ہے سنگ وخشت
میں حرفِ حق کو سجا کر ہوئی ہوں شرمندہ

رہِ وفا میں کوئی ایسا واقعہ گزرے
سوال اس کا ہر اک لاجواب کر دے مجھے
میں حرف حرف کی صورت بکھرتی جاتی ہوں
وہ انتساب لکھے اور کتاب کر دے مجھے

یوں ہی جینے کا یوں ہی مرنے کا
زندگی نام فرض کرنے کا
جب عدم سے وجود میں آئے
موت سے کیا محل ہے ڈرنے کا

❁

وقتِ رخصت وہ آنکھ کے آنسو
گرم جوشی روانہ ہونے پر
یاد آئے گی ایک بھول تمھیں
اک حقیقت فسانہ ہونے پر

❁

کلیسا ، بت کدہ محراب و منبر
مرا دل مثلِ کعبہ ہو گیا ہے
میں قائم ہوں تو حق گوئی پہ لیکن
مرا دامن دریدہ ہو گیا ہے

❁

ان کی تنقید مناسب نہیں ہوتی لوگو
جن کے دامن پہ ہوں دھبے کسی رسوائی کے
میرے زخموں کو ہرا کر دیا پوچھا یوں حال
تم بھی مفہوم سے واقف ہو مسیحائی کے!

کھنڈر میں دل کے جنوں کے سراغ ملتے ہیں
فصیلِ درد پہ روشن چراغ ملتے ہیں
بہت دنوں سے میں آسودۂ سخن بھی نہیں
نہ فکر و فہم کے مجھ کو ایاغ ملتے ہیں

وہی قدیم حکایت وہی روش دل کی
وہ سرد مہری کسی کی وہی خلش دل کی
وہ چاند پورا تمنا کا یاد کی لہریں
اور ایسے وقت میں بڑھتی ہوئی کشش دل کی

تلاشِ دوست میں لمحوں کو رائیگاں کر کے
اکیلی ہو گئی رازوں کو میں عیاں کر کے
نہ مل سکا کوئی مخلص تو میں نے آخرِ کار
قلم سے دوستی کر لی اُسے رواں کر کے

پھولوں سے محبت میں گلستان کی خاطر
کانٹوں کے ہر اک وار کو یوں دل نے سہا ہے
ہونٹوں پہ کوئی حرفِ شکایت بھی نہیں ہے
چپ ہیں کہ یہی اپنی محبت کا صلہ ہے

آسماں پر جو دھنک چھائے گی
میرے آنچل کی خبر لائے گی
اُس کا جب ذکر چھِڑے گا تو صبا
گل سے خوشبو اُڑا کے لائے گی

وضاحتوں سے تو دل صاف ہو نہیں سکتا
میں خامشی کی گواہی کو اختیار کروں
وہ چاہتا ہے گرادے مری نظر میں مجھے
میں کیوں نہ آخری حربے کا انتظار کروں

یہ آج، میرے کل کی صفیں کاٹ رہا ہے
قاتل ہے یہی وقت، لہو چاٹ رہا ہے
بنیاد نہ ہل جائے کہیں اپنے ہی گھر کی
اس واسطے دیوار کو اب پاٹ رہا ہے

سرحدِ دل کے تم نگراں تھے راہِ وفا پتھریلی تھی
ایک محاذ پہ ساتھ رہے پر ایک جگہ میں اکیلی تھی
رشتوں کے بندھن میں مجھ کو باندھ رکھا تھا لوگوں نے
جس کو تم نہ بوجھ سکے میں ایسی ایک پہیلی تھی

وقت ایسا ہے کہ دشمن بھی گلے ملتے ہیں
آسمان اور زمیں شام ڈھلے ملتے ہیں
دشتِ امکان میں اک بات بتا دو ہم کو
کیا کہیں نخلِ تمنا بھی پھلے ملتے ہیں

ہر اک منزل پہ تازہ امتحاں ہے
کہیں صحرا کہیں کوہِ گراں ہے
چھپے ہیں غم کے ایسے لعل و گوہر
یہ دل جیسے کہ بحرِ بیکراں ہے

چشمِ حیراں میں بلائے ناگہانی درج ہے
جھرّیوں میں زندگی بھر کی کہانی درج ہے
وقت کے سورج نے چپکایا ہے اک اک زلف کو
اس انوکھے رنگ میں عہدِ جوانی درج ہے

''زور'' لباسِ تقویٰ پہن کے آیا ہے
''زر'' قارونِ وقت کا اصل میں جایا ہے
ظلم کا بادل چاروں جانب چھایا ہے
کیوں قابیل کا دنیا بھر پہ سایہ ہے

افکارِ عمیق

اے ولولۂ شوق فقط تیری وجہ سے
محفل میرے افکار کی حکمت سے بھری ہے
اے حلقۂ مقصود تری شانِ نرالی
اک راہ اگر طے ہوئی راہ کھڑی ہے......!
جمود حقیقت میں ہے تاثیرِ سمِ جاں
تحریک میں قوموں کی حیاتِ ابدی ہے

پرانے سکّے

اصحابِ کہف کی صورت ہم
بازارِ عالم سے اکثر
جب کوئی خوشی لینا چاہیں
تو چھوٹے بڑے سارے تاجر
یہ کہہ کر ہمیں لوٹاتے ہیں
وہ سکّے جو کہ کیسہ میں
ہیں آپ سنبھالے آج تلک
حق گوئی، مروت اور خلوص

تہذیب، حیا، وضع داری
یہ سکّے بڑے پرانے ہیں
ہیں آپ بڑی دقیانوسی
یہ سکّے اب کہاں رائج ہیں
آپ اپنے غارِ ہستی میں جا کر آرام سے سو جائیں

ویلنٹائن ڈے

میری بیٹی نے مجھ سے یہ پوچھا
اماں! ویلنٹائن آیا ہے
کیسے یہ دن منایا جاتا ہے؟
کیا یہ دن آپ نے منایا تھا؟
آپ اس روز کیا پہنتی تھیں؟
اور تحفے میں کیا خریدتی تھیں؟
میں نے ہنستے ہوئے کہا اُس سے

میری بیٹی عجیب لوگ تھے ہم

زندگی تھی ہماری جس کے لیے
اس کا پھر یوم کیا مناتے بھلا
سارے آنچل میں رنگ اسی کے تھے
پھر محبت کو کیا جتاتے بھلا
ہم نے اِک دوسرے کو تحفے میں
ذات ہی اپنی نذر کردی تھی
اور تم نسلِ نو کی شہزادی
سال بھر میں بس ایک وصل کا دن!!!
تم محبت میں ہو غریب بہت
اور ہم لوگ تھے عجیب بہت

ریت کے بگولے

کھنکتے قہقہوں میں
چوڑیوں کی کھنکھناہٹ میں
دمکتے عارضوں پر
اور لبوں کی مسکراہٹ میں
مہکتے پھولوں میں پنہاں
شجر کی سرسراہٹ میں
مری ہستی بھی فانی اور یہ جذبے بھی فانی ہیں

مسرت ختم ہو جاتی ہے غم کی دھوپ چھاتی ہے

کلائی خالی ہو جاتی ہے چوڑی ٹوٹ جاتی ہے
گلوں کی پتیاں جھڑتی ہیں شاخیں سوکھ جاتی ہیں
سراغِ زندگی میں آنکھیں میری تھک سی جاتی ہیں
تو میں تھک ہار کر اک درد کی دہلیز پر بیٹھی
زمین و آسماں کے درمیاں کچھ تکنے لگتی ہوں
بگولے ریت پر پھر رقص کرتے مجھ سے کہتے ہیں
تمھیں کیا زیست کے مفہوم اور معانی سمجھنے ہیں
ذرا سی خاک اُڑا کر تم فضاؤں میں اُڑا دینا
یہی ہے زندگانی اور یہی ہستی تمھاری ہے

ہمارا رقص جاری تھا ، ہمارا رقص جاری ہے
بھٹکتی روح کی صورت ہمارا رقص جاری ہے

کسبِ سخن

چُنتے ہیں مخزنِ ادراک سے حروفِ گہر
زمینِ لفظ سے معانی کشید کرتے ہوئے
قرأتوں کے سمندر میں لہر لہر حروف
ہمارے خوابِ پریشاں کو مجتمع کرکے
کفِ سطور پہ آ کے بکھر سے جاتے ہیں
مگر حروف و معانی سے ماورا اکثر
متن کلام کا دل میں اتر سا جاتا ہے
صحیفہ دل کا ہے الہامی اور مرے افکار
ذہن کی لوح پہ آ کے چمکنے لگتے ہیں
میں کشفِ ذات سے کسبِ سخن کماتی ہوں

بیوہ

جو وہ آتی تو اپنے ساتھ فصلِ گل کو لاتی تھی...!

اُن اُجلے اُجلے ہاتھوں میں
کنگن کی شان نرالی تھی
اور کالی کالی آنکھوں سے
تاریکئ شب شرماتی تھی
جُوڑے میں پھول جو باندھتی تھی
ہر شے پہ بہار آ جاتی تھی
جب مانگ میں افشاں چُنتی تھی

تو اوجِ ثریا لگتی تھی
اور سرخ لبوں کی نرمی پہ
تو بادِ صبا اٹھلاتی تھی
سب سولہ سنگھار تو ایک طرف

وہ ایک سہاگن ناری تھی
پھر فصلِ بہاراں چند گھڑی
اور فصلِ خزاں کی لمبی صدی
ویران کلائی تھی اُس کی
اور اُجڑی مانگ چھپائے ہوئے
رنگین دوپٹے کے بدلے
بے رنگ ردا لہرائے ہوئے
ہر آنے جانے والوں سے
یہ پوچھتی ہے کہ اے لوگو!
یہ فصلِ خزاں کب بیتے گی
کب رنگ مرے لوٹائے گی
کوئی کیسے اُسے بتلائے گا
کوئی کیسے اُسے سمجھائے گا
وہ دل کو کیا سمجھائے گی
جو شاخ سے پتہ ٹوٹ گیا
کیا لطفِ بہار اُٹھائے گا
اب تجھ پہ نکھار نہ آئے گا......

گونگی دیوی

آپ دلکش ہیں
آپ کی آنکھیں
مصرعۂ فیضؔ کی طرح گہری
آپ کا حسن جیسے غالبؔ کا شعرِ دوآتشہ پڑھا جائے
آپ مل جائیں تو جنابِ من عمر پوجا ہی میں گزر جائے
قدر دانی کا شکریہ جاناں
انکشاف ایک کرنا چاہتی ہوں
ذہنِ تازہ میں ہیں خیال نئے

آپ اس کو گوارا کرلیں گے؟
آپ سے گر میں اختلاف کروں
آپ پھر بھی عزیز رکھیں گے؟
مسکرا کر یہ پھر کہا اس نے
حسن اور فلسفہ ارے توبہ
چھوڑیئے اور کوئی بات کریں
دیویاں گونگی اچھی لگتی ہیں

آدھی گواہی پوری سزا

کس کی بیٹی ہوں
اور بہن کس کی
کس کی بیوی ہوں
اور ہوں ماں کس کی
میری اپنی کوئی شناخت نہیں
جرم کے باب میں تو پوری ہوں
پھر بھی آدھی گواہی ہے میری
میرے الجھے سوال پر بولا

کیسی خودسر ہے تو خدا کی پناہ
کتنے باغی خیال ہیں تیرے
تو جو اپنی شناخت چاہتی ہے
پیدا ہوتے ہی مر گئی ہوتی

خانہ جنگی

آدھی رات کے سناٹے میں
چور کھڑے تھے ساماں باندھے
گشت پہ چوکیدار تھا باہر
اُس کے لب پر ایک صدا تھی
سب ہے ٹھیک...اے سونے والو
بے فکری سے سوتے رہنا
خطرہ باہر کوئی نہیں ہے

کربِ تخلیق

کربِ تخلیق سے گزرتے ہوئے
کھنچ رہی تھیں مری رگیں ساری
خون کے بدلے آگ دوڑتی تھی
سانسیں نشتر کی طرح چبھتی تھیں
میں نے فریاد کی خدا سے پھر
مجھ کو تکلیف سے نجات دلا
یا مجھے موت دے دے میرے خدا !
ساری دنیا کا درد جیسے کہ

میرے پہلو میں آن بیٹھا تھا
کسی پہلو مجھے قرار نہ تھا
وقت کی نبض تھم گئی اور پھر
اک صدا آئی مجھ کو رونے کی
ماں کی تکلیف میں شریک تھا وہ
اُس گھڑی سارے دُکھ بھلا کر میں
دیکھ کر اس کو مسکرائی تھی
اپنی ماں مجھ کو یاد آئی تھی......
میرے خالق نے میرے پہلو سے
اک نئی زندگی ہویدا کی
کربِ تخلیق کا صلہ یہ دیا
درد سے زندگی اُبھر آئی

زندگی ہے فنکاری

کھلی ہوا میں چلو سانس لیں کہ کمرے میں
گھٹن بہت ہے اداسی ہے سوگواری ہے
ہماری آنکھوں میں برسوں کی شب بیداری ہے

کبھی کبھی تو یہ احساس بڑھتا جاتا ہے
کہ جیسے زندگی کٹتی ہے رات کی مانند
اک ایسی رات کہ جس کو ہمیں گزارنا ہے
بغیر نیند کے خوابوں کے، اور تاروں کے
تمام رات کا حاصل ہو کروٹیں لینا

یہ کروٹوں کا سفر کس قدر کٹھن ٹھہرا
شبِ حیات کو طے کرنا ایک فن ٹھہرا
سو ہم بھی رات گزاریں گے اس طرح اپنی
کہ کروٹوں کی شکن زندگی کی چادر پر
کوئی بھی دیکھنے والا نہ دیکھ پائے گا
ہماری آنکھ میں آنسو کبھی نہ آئے گا
شبِ حیات کا فن آتے آتے آئے گا

اندھے گواہ

مرے چہرے پہ جو آنکھیں ہیں
وہ منظر، پیش منظر اور پس منظر
پہ جا کے ٹھہر جاتی ہیں
مرے ہونٹوں پہ جو الفاظ آتے ہیں
مجھے افسوس ہے وہ مصلحت سے ناشناسا ہیں
ہمیشہ ظلم کے بازار میں میری گواہی رد ہی ہوتی ہے
مگر وہ فرد جو کہ ظاہری باتوں کا عادی ہے

اُسے معلوم ہے
کب بولنا ہے، کس گھڑی خاموش رہنا ہے
وہ اکثر جیت جاتا ہے
اُسی اندھے گواہ کی سب دلیلیں مان لیتے ہیں
مری آنکھیں مرے الفاظ سارے ہار جاتے ہیں

گُرگ آشتی

باہر ہر سمت کثرت برف کی ہے
اور اس موسم میں بھوکے بھیڑیئے
دس، بیس یکجا اس طرح سے ہیں
شکم کی آگ سے وہ تنگ ہیں
اور اس مصیبت میں
ہر اک لمحہ وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بیٹھے ہیں
کسی کی آنکھ جھپکی اور جھٹ مل کے بیٹھے ہیں

وہ اس کو پھاڑ کھائیں گے
بہت بدذات ہیں وہ سب کے سب
اک دوسرے کی خصلتوں کو جانتے ہیں
کسی کا داؤ کب چل جائے یہ پہچانتے ہیں

رسم کے قیدی

بوڑھی قدریں کچھ کمزور سی رسموں کو
دودھ پلا کر زندہ رکھنا چاہتی ہیں
عقل کے دشمن لوگوں کو یہ
روز ہی دھوکا دیتی ہیں
دھوکا کھانے والے دھوکا کھا کر بھی
گلے لگا کر ان کو زندہ رکھتے ہیں
عقل ہمیشہ شرمندہ ہی رہتی ہے

رسم و رواج کے سامنے مات ہی کھاتی ہے
چور محافظ بن کے گھوما کرتا ہے
ایسی بستی لٹنے پہ خوش ہوتی ہے
لٹ کے بھی سب جشن منایا کرتے ہیں

راستے دل کے ہیں طے کرنا تو اے فرزانو !!
عقل اب عشق کی انگلی کو پکڑ کے نکلے

ربطِ پیہم

عجب ہے ربطِ پیہم عہدِ رفتہ عہدِ جاری میں

ہمیشہ شام کے سائے افق پہ جب بھی چھاتے ہیں
مِرے سوئے ہوئے جذبات کو آ کر اُٹھاتے ہیں
وہ لمحے پھر مِرے ماضی سے مجھ کو آ ملاتے ہیں

کبھی وہ کیاریاں میں نے صحن میں جو بنائی تھیں
وہ ننھے ننھے پودے جو کبھی میں نے لگائے تھے

انھیں جب سینچتی تھی میں تو اک خوشبو سی اٹھتی تھی
مجھے مٹی کی وہ خوشبو بڑی بے چین کرتی ہے
مشامِ جاں میں اب تک وہ کہیں محفوظ ہوتی ہے

عجب ہے ربطِ پیہم عہدِ رفتہ عہدِ جاری میں

❁

صرف بچایا اک مقصد کی خاطر اور
عشق کیا پھر ہم نے خود کو خرچ کیا

شجرۂ نسب

اپنے اسلاف کے ناموں پہ فقط زندہ ہیں!!!
اپنا شجرہ ہے رسولِ عربیؐ کا شجرہ
اپنا خوں وہ ہے جو ہر دور میں پانی کی طرح
کربلا میں کبھی کوفہ میں بہا کرتا تھا
قصر کے گارے میں وہ خون ملا کرتا تھا
ہاں مگر تخت کے پائے کو ہلا دیتا تھا
اپنے اجداد کی عزت کی شرافت کی قسم

آج تہذیب و ثقافت کی یہ تصویر بنی
ہر بُری رسم گلے ہم نے لگا رکھی ہے
کوفہ والوں کی طرح شکل بنا رکھی ہے
کاش کردار سنور جائیں تو پہچان بنیں
ہم فقط، نام و نسب کے نہ مسلمان بنیں
آج ہم لوگ کہ دامن میں اندھیرے کو لیے
اپنے اسلاف کے ناموں پہ فقط زندہ ہیں

صفحۂ قرطاس

ہار سنگھار کے پھولوں جیسے زرد سنہری
خوشبو رات کی رانی اور چنبیلی جیسی
سرخ گلاب کی طرح لو دیتے الفاظ
جانے کیسے دل کی کتاب سے اُٹھ کر یہ
صفحۂ قرطاس پہ یوں آباد ہوئے ہیں
پورا صفحہ مثلِ چمن آباد ہوا ہے
دل کے زخم کی صورت کتنا ہرا بھرا ہے

شاعری کا ماہِ تمام

پروین شاکر کی نذر

وہ جو صبا مثال تھی جانے کدھر گئی
''خوشبو'' کو عام کر کے جہاں سے گزر گئی

احساس کا دریچہ سجایا تھا کس طرح
''صد برگ'' اس کے کرب کا اظہار کر گئی

سودا تھا نقدِ حرف کا بازارِ زیست میں
اہلِ سخن کے واسطے ''انکار'' کر گئی

فکری سفر شعور کا جادہ لیے ہوئے
وہ ''خود کلامی'' کرتے ہوئے کام کر گئی

وہ چاندنی کا نرم سا لہجہ تھی ذات میں
''ماہِ تمام'' کی طرح دل میں اُتر گئی

اُردو ادب میں نام فروزاں رہے ترا
خود بجھ گئی چراغ سرِ راہ دھر گئی

قصرِ ابیض فکرِ اسود

ابھی کچھ دیر پہلے
قصرِ ابیض سے
ہوا ہے حکم یہ جاری
سفید و مست ہاتھی نے
کیا چنگھاڑ کر اعلانِ خاص و عام
دنیا کی سبھی قومیں
سبھی افراد اب اس کی پناہ میں ہیں

سبھی اس کی نگاہ میں ہیں
غضب سے شاہِ والا کے
جو بچنا چاہتے ہو
تو
سب ہی ہتھیار مہلک اپنے اپنے جمع کرادو
اسی میں عافیت سب کی
اسی میں خیریت سب کی

شہِ والا......!
بجا یہ حکم سرکاری
خوشا عالم کی سرداری
مگر
اتنی اجازت ہو
اماں گر جان کی پائیں
تو ہم یہ پوچھنا چاہیں
کہ وہ جو زہر کا انبار ہے شاہی خزانے میں
وہ کیا تریاق کا حامل ہوا ہے اس زمانے میں

حضورِ محترم!
جو اسلحے کا ڈھیر رکھا ہے
بھلا انسان کے کس کام آتا ہے
یہ مانا آپ ٹھیکیدار ٹھہرے امنِ عالم کے
مباح ہے ایشیا کا خون بھی سچ ہے

شہِ والا!
ہمیں اپنے رویّے پر ندامت ہے تو اتنی ہے
حضور!
ہم آج اپنا سر اٹھا کر بات کرنا چاہتے ہیں
لرزتے کانپتے ہاتھوں سے آئینہ دکھاتے ہیں
جو چاہیں تو
ہمیں اس جُرم کی پاداش میں سولی پہ لٹکائیں
ہماری نسلِ نو کے
ذہن بھی نیلام کر ڈالیں
مگر
بولی لگانے والوں کو یہ
یاد رکھنا ہے

غرور ونخوت وجاہ وحشم
اک ریت کی دیوار ہوتا ہے
ہوا کے تیز اک جھونکے سے
یہ مسمار ہوتا ہے
شہِ والا......!
کہانی وہ پڑھی ہوگی
نہیں تو پھر سنی ہوگی
کہ ہاتھی والوں پہ ننھے پرندے
حملہ آور تھے
اور جب کنکر برستے تھے
نہ ہی لڑنے کا یارا تھا

نہ ہی کوئی سہارا تھا
بہت انجام عبرتناک تھا ان کا
ہمیں بس اتنا کہنا ہے
کہیں یہ قصرِ ابیض
فکرِ اسود سے نے جل جائے

یہ آواز کس کی ہے

عجب دورِ ترقی ہے
کہ جس جانب بھی دیکھو
برق کی رفتار سے سب بڑھ رہے ہیں
مشینوں کی زباں میں بات کرتے ہیں
تو
براعظموں میں
فاصلے کچھ بھی نہیں رہتے
مگر اس دور میں
انسان کو اتنی نہیں فرصت

کہ وہ تنہائی میں اندر کی آوازوں کو سن کے
یہ بھی سوچے
دل بھی اکثر بولتا ہے
یہ ٹیلی فون، انٹرنیٹ نہ کوئی رابطہ مانگے
یہ جب آواز دیتا ہے
تو اپنی ذات کے عُقدے
خود اپنے آپ پر پھر کھلنے لگتے ہیں
تعارف خود سے ہوتا ہے
مگر انسان کو
اتنی بھی فرصت مل نہیں پاتی
کہ وہ جانے سے پہلے اک دفعہ
اپنے سے مل کر
صرف یہ سوچے
کہ
میں ہوں کون یہ آواز کیسی ہے

ردائے ہجر

انتساب

اُن دوستوں کے نام
جو معدوم ہوتی ساعتوں میں موجود رہے

❁

ہماری قربتوں میں فاصلہ نہ رہ جائے
قدم سے لپٹا ہوا راستہ نہ رہ جائے

ہوائے وحشتِ دل تیز چل رہی ہے بہت
ردائے ہجر مرا سر کُھلا نہ رہ جائے

خدا کے نام پہ جس طرح لوگ مر رہے ہیں
دعا کرو کہ اکیلا خدا نہ رہ جائے

یہ لوگ کس لیے اپنے طواف میں ہیں مگن
صنم کدے میں مصلاّ بچھا نہ رہ جائے

طنابیں کاٹ رہا ہے وہ خواہشوں کی مری
کہیں پہ دشت میں خیمہ لگا نہ رہ جائے

یہ لمحہ لمحہ جو ہم جامِ ہجر پی رہے ہیں
تو تشنگی کا سلیقہ دھرا نہ رہ جائے

مجاورانِ ادب اِک نظر عنایت کی
غزل کی شکل میں کتبہ لگا نہ رہ جائے

دشتِ دل میں کبھی اک ناقہ سوار آیا تھا
آج تک مجھ میں بہت گرد اڑا کرتی ہے

تمام عمرِ رواں کا مآل حیرت ہے
جواب جس کا نہیں وہ سوال حیرت ہے

دکانِ چشم یہاں بے مثال حیرت ہے
اس آئنے کا سراسر کمال حیرت ہے

یہ زندگی تو ترے ساتھ ساتھ ختم ہوئی
جو مجھ میں باقی ہے وہ لازوال حیرت ہے

وہ خواب ایسے تھے تعبیر ان کی تھی ہی نہیں
رمیدہ ہجر ، گریزاں وصال حیرت ہے

ہوئی طلسم زدہ جب یہ آئنے نے کہا
یہاں تو سارے کا سارا جمالِ حیرت ہے

عدم ، وجود ، عدم اُف یہ سلسلے کیسے
میں لُٹ گئی ہوں مگر مالا مال حیرت ہے

یہ کائنات ہے حیران اپنے ہونے پر
قدم قدم پہ یہاں محوِ حال حیرت ہے

میں راکھ ہونے کو ہوں تُو مری چمک پہ نہ جا
چراغ بجھنے سے پہلے بھڑکنے لگتا ہے

جو بھی گیا وہ خاک بسر رائیگاں گیا
یہ کیا ہوا کہ سارا سفر رائیگاں گیا

بازار میں ضرورتیں لے آئی ہیں مگر
قیمت کے باوجود ہنر رائیگاں گیا

ہم کیسے دل گرفتہ تھے یہ سوچ سوچ کے
یہ سلسلہ جو ہے یہ اگر رائیگاں گیا

اب طائرِ امید بھی آئے تو کس جگہ
دل میں لگایا تھا جو شجر رائیگاں گیا

اے شہریارِ دیدہ و دل تم کہاں گئے
منظر گیا تو حسنِ نظر رائیگاں گیا

پہلو میں ایک دل تھا ، زمانہ خراب تھا
کتنا بچا کے رکھا ، مگر رائیگاں گیا

طلوع ہجر ہوا ، اور وصال ڈوب گیا
ہمارا خواب ، تمھارا خیال ڈوب گیا
جہازِ لذّتِ گفتار ڈھونڈنے والو!
تمھیں خبر نہیں کہ سارا مال ڈوب گیا

❁

ہوئے ہو کس لیے برہم عزیزم
سرِ تسلیم ہے لو خم عزیزم

چراغِ حجرۂ جاں کی خبر لو
لبوں پر آ گیا ہے دم عزیزم

تم آتے ہو تو دم آتا ہے گویا
تم آتے ہو مگر کم کم عزیزم

نبود و بود کی اس کش مکش میں
عجب ہے حالتِ پیہم عزیزم

توئی تو ہے، میں قطرہ تو سمندر
یہ من آنم کہ من دانم عزیزم

ہمی ہیں کشتگانِ وقتِ رفتہ
عزیز از جان ہیں یہ غم عزیزم

وجودِ رفتۂ رفتارِ منزل
سرائے ہستیِ عالم عزیزم

خمارِ تشنہ کامی چشم گویم
شنیدن عکسِ جامِ جم عزیزم

عجیب ہی سفر تھا اپنی ذات کی تلاش کا
اب آگہی یقین سے گمان بن کے رہ گئی

کاوشِ روزگار نے عمرِ رواں کو کھا لیا
دشتِ سکوت نے مرے زمزمہ خواں کو کھا لیا

ہائے وہ صبحِ بے بسی ہائے وہ شامِ بے کسی
ساعتِ بد نے اس دفعہ آ زُردگاں کو کھا لیا

تذکرے رہ گئے فقط وہ بھی ہیں کتنی دیر تک
تو نے سکوتِ بے کراں حرف و بیاں کو کھا لیا

کاسۂ وقت میں کوئی سِکّہِ روز و شب کہاں
بادِ فنا نے خطرۂ سود و زیاں کو کھالیا

ہستیِ خوش گماں سنبھل سوچ سمجھ کے چال چل
عالمِ نیست نے ہر اِک نام و نشاں کو کھا لیا

خیمۂ وصل جل گئے ہمراہی رِہ بدل گئے
اور شبِ فراق نے قلبِ تپاں کو کھا لیا

میں ارتکازِ تمنا سے اب گریزاں ہوں
غزالِ حسرتِ دل کو رہائی چاہیے ہے
ہے ریگ زارِ سخن منتشر مرے اندر
میں مٹ رہی ہوں مجھے روشنائی چاہیے ہے

بڑے تپاک سے بھیجا سلام وحشت نے
کیا سکوت میں ہم سے کلام وحشت نے

تمھیں بتاؤ کہ ہم خود سے بچ کے جائیں کہاں
ہمیں تو سونپ دیا سارا کام وحشت نے

امورِ سلطنتِ دل کی خیر ہو یا رب
یہاں سنبھالا ہے سب انتظام وحشت نے

سب اپنا اپنا تعارف کرا رہے تھے مگر
گلے لگا کے لیا میرا نام وحشت نے

پھر اس کے بعد کبھی ہوش میں رہے ہی نہیں
ہمیں پِلایا تھا بس ایک جام وحشت نے

یہ کیا خرد کے رہے اور نہ ہم جنوں کے رہے
کچھ اس طرح سے لیا انتقام وحشت نے

عجیب تیرگیِ ذات کا تھا سناٹا
خود آگہی کا کیا اہتمام وحشت نے

❁

اس سے پہلے کہ تر ا دشت مجھے راس آ جائے
اپنی وحشت کو اٹھاؤں گی چلی جاؤں گی

مریضِ عشق کا بہت عجیب حال ہو گیا
عجیب حال ہو گیا تو پھر وصال ہو گیا

وہ کہہ رہا تھا زندگی گزارنا محال ہے
اور اب یہ کہہ رہا ہے یار! کیا کمال ہو گیا

میں شدتِ بیان سے نکل سکوں تو پھر کہوں
یہ میرا لہجۂ سکوت بے مثال ہو گیا

بہت ہوا تو یہ ہوا فریبِ آرزو یہاں
طلب کے آئنے پہ عکس پُر جمال ہو گیا

ہے آج بھی وہ منتظر تری نگاہِ ناز کا
جو سبزہ تیرے راستے میں پائمال ہو گیا

میں دامنِ تہی سے تم کو یاد کرنے بیٹھی جب
خزانۂ خیال میرا مالا مال ہو گیا

❁

گفتگو ہوتی رہی ، ہوتی رہی ، ہوتی رہی
پھر بھی کہنا تھا جو وہ کہہ نہیں پائے دونوں
شدتِ فصلِ محبت تو مقدر سے ملی
ایسا لگتا ہے اسے سہہ نہیں پائے دونوں

فریبِ عمرِ گزشتہ کہاں لکھا جائے
یہ طے ہوا ہے کہ بس رائیگاں لکھا جائے

سب اپنی اپنی ضرورت سے اس میں رہتے رہے
بجائے گھر کے اسے اب مکاں لکھا جائے

شکستِ دل کی صدا کون لکھ سکا ہے بھلا
شکستِ دل کی صدا کو کہاں لکھا جائے

میں آئینے کی گواہی میں خود بھی شامل ہوں
خلاف اپنے ہی میرا بیاں لکھا جائے

فروخت مصر کے بازار میں ہے حسنِ طلب
ہمیں بھی یوسفِ بے کارواں لکھا جائے

نہ پوچھ کیسے وہ اپنی کہانی ختم کرے
قبول و رد کے جسے درمیاں لکھا جائے

ہیں ریگزارِ تمنا پہ نقشِ پا تیرے
ہر ایک ذرّہ مرا ہم زباں لکھا جائے

میں اک خرابۂ کردار میں سِسک رہی تھی
تو پھر کہانی نے اپنی طرف بلایا مجھے
عجیب درد کی تھی بانسری جو بجتی رہی
عجیب زخم تھا جس نے لہو رلایا مجھے

دن کا راجا ہوتا ہے اور رات کی رانی ہوتی ہے
ہر خوشبو کی اپنی اپنی ایک کہانی ہوتی ہے

پہلے اک اک خواب سے ہم تعمیرِ تمنا کرتے ہیں
پھر دل میں تعبیر کی خود ہی خاک اڑانی ہوتی ہے

پہلا شگوفہ حیرت کا دنیا کو دیکھ کے پھوٹا تھا
اُس کے بعد تو جیون بھر خود پر حیرانی ہوتی ہے

رات اماوَس کی ہے سر پر اور سناٹا دور تلک
دل دریا میں سوچتی ہوں کیسے طغیانی ہوتی ہے

یادوں کے ویرانے سے کچھ روشنی حاصل کرتے ہیں
ان آنکھوں کی دل میں جب تصویر بنانی ہوتی ہے

ابرِ نیساں جب برسا آغوش صدف نے پھیلائی
پہلا قطرہ بارش کا تو پہلی نشانی ہوتی ہے

میں صرف ہو رہی ہوں ضرورت کے واسطے
عشرت گہِ حیات کی فرحت کے واسطے
بے چہرگی میں صورتِ تکمیل کے لیے
آئینہ تک رہی ہوں میں حیرت کے واسطے

ہم سے آشفتہ مزاجوں کا پتا پوچھتی ہے
کتنے باقی ہیں دیے روز ہوا پوچھتی ہے

روز کلیوں کو کھلاتے ہوئے کرتی ہے سوال
کیسی دامن کی مہک ہے یہ صبا پوچھتی ہے

کس جگہ تجھ کو ٹھہرنا ہے تمنائے جہاں
لڑکھڑاتے ہوئے یہ لغزشِ پا پوچھتی ہے

تشنگی اور ہے صحرائے تمنا کتنی
جو برستی نہیں کُھل کے وہ گھٹا پوچھتی ہے

رقص کرتے ہوئے ذروں سے میں سنتی ہوں صدا
گرد اڑتے ہوئے انجام مرا پوچھتی ہے

مہرباں گردشِ حالات ہے اتنی مجھ پر
کوئی پوچھے کہ نہ پوچھے یہ سوا پوچھتی ہے

❁

عجیب خواب تھا پھر اس کے بعد سو نہ سکی
خیال میں بھی نہ تھا وہ کبھی جدا ہوگا
ہر ایک موجِ تمنا نے سر اٹھا کے کہا
سوالِ تشنہ لبی اٹھ گیا تو کیا ہوگا؟

زندگی نے پھرایا اِدھر سے اُدھر طے کِیے کتنے دیوار و در دوستو!
دھوپ میں کٹ گیا اپنا سارا سفر راستے میں نہ آیا شجر دوستو!

ایک مدت ہوئی گھر سے نکلے ہوئے ایک عرصہ ہوا خود سے بچھڑے ہوئے
پاؤں رستے سے مانوس ہونے لگے ختم ہوتا نہیں یہ سفر دوستو!

دھیرے دھیرے غموں سے سلگتی رہی شامِ تنہائی کیسے پگھلتی رہی
ہجر کی شب ہواؤں کے ہوتے ہوئے شمعِ محفل جلی رات بھر دوستو!

ایسی یک جائی تھی فرق کچھ بھی نہ تھا، تجھ میں میں رچ گئی، مجھ میں تُو بس گیا
حرف سے لفظ بنتے گئے اور پھر عشق نے کر دیا معتبر دوستو!

ایک کردار کو ہم نبھاتے رہے اپنے کو ہر قدم آزماتے رہے
شب گزرنے کو ہے رات ڈھلنے کو ہے اب کہانی کریں مختصر دوستو!

جو آرہا ہے نظر وہ اگر نہ ہو ، کیا ہو؟
اگر وجود عدم ہی کا ایک وقفہ ہو؟

وہ رفتہ اور یہ موجودہ اور وہ فردا
پتا چلے کہ تمھاری نظر کا دھوکا ہو

یہ صبح و شام کی تکرار اور رقصِ خرد
قدم قدم پہ یقیں میں گماں کا جلوہ ہو

میں اپنے گرد کہاں تک طواف جاری رکھوں
اس آگہی کے سفر میں کہیں تو رکنا ہو

کسی کی ناؤ تو ساحل سے جا لگے لیکن
کسی کو لہروں نے اپنا بنا کے چھوڑا ہو

ہمیں بھی کارِ جنوں میں کمال ہو حاصل
تمھیں بھی اپنے ہی ہاتھوں تماشا بننا ہو

ترے خیال سے آگے مری نظر پہنچے
ہمارے عشق کا ہر اک زباں پہ چرچا ہو

عشق وہ چشمۂ بے فیض ہے جس سے اکثر
تشنگی ظرفِ تمنا کو عطا ہوتی ہے

بجز سکوت نہیں پاس کچھ سخن کے لیے
ہوں ماورائے صدا اہلِ انجمن کے لیے

صدائے دیدۂ نم ناک ہے لباسِ زیاں
کہ زندگی نے برہنہ کیا کفن کے لیے

سرابِ ہستیِ جلوہ گری کے بعد بھلا
میں اہتمام بھلا کیا کروں بدن کے لیے

دھنک کے رنگوں کی پرواز مجھ میں جب ہوتی
میں تتلی کاڑھنے لگتی تھی پیرہن کے لیے

صلیبِ لذت آزار اپنے آپ میں ہوں
تماشا ہائے نظر قیس و کوہ کن کے لیے

تو اپنے غنچۂ دل سے ہی خود گواہی لے
مثال بادِ صبا تھی ترے چمن کے لیے

❁

ہم پیاس کو اپنی پی رہے ہیں
مرنے کے لیے ہی جی رہے ہیں
اس چاک بدن کی دھجیوں کو
ہر سوزنِ نفس سے سی رہے ہیں

❁

سکوتِ عصر میں گونجی ہوئی اذان ہوں میں
بہت سے کرسی نشینوں کے درمیان ہوں میں

ادب کی کرب و بلا کوفۂ صدا ہے گواہ
ہوائے شام کا لکھا ہوا بیان ہوں میں

وہ خیمہ گاہِ محبت تو جل گئی کب کی
اوراس کی راکھ میں مدت سے نیم جان ہوں میں

فراتِ تشنگیِ شوق رُو بہ رُو تیرے
جسے جلایا گیا تھا وہی مکان ہوں میں

وہ ٹوٹا نیزہ ، وہ بے چادری ، وہ شامِ الم
کبھی جو ختم نہ ہوگی وہ داستان ہوں میں

گلوئے تشنہ لبی دیکھ کس سلیقے سے
کشیدہ تیر سنبھالے ہوئے کمان ہوں میں

شریعتِ دل و دنیا اٹھائے پھرتی رہی
وہ کہہ رہا ہے مگر پھر بھی ناتوان ہوں میں

یہ بام و در کو سجایا گیا ہے میرے لیے
نظارگی تری خاطر لہولہان ہوں میں

❁

میں وہ زلیخا تھی جس نے کبھی بھی یوسفؑ پر
کوئی بھی تہمتِ نامہرباں لگائی نہیں

آج کی رات چراغوں کو بجھا رہنے دے
درد کو ہجر کے پہلو سے لگا رہنے دے

دیکھ ! تجھ کو نہیں اندازۂ وحشت شاید
اک جلا خیمہ ہی صحرا میں لگا رہنے دے

تو مرا سازِ گرفتہ نہیں سن پائے گا
ایسا کر تو مجھے تصویر بنا رہنے دے

تشنگی کے مرے قصّے نہ زمانے کو سنا
مجھ کو دریا کے کنارے ہی پڑا رہنے دے

کوزہ گر چھوڑ گیا مجھ کو بکھرنے کے لیے
اب مِری خاک کو مٹی میں ملا رہنے دے

تعزیت کرنی ہے خود سے دلِ مرحوم مجھے
تعزیہ خانے میں یہ فرشِ عزا رہنے دے

خالی ہاتھوں سے دعاؤں کے سوا کیا کرتے
جب مسیحا نے کہا ، اب یہ دوا رہنے دے

زندگی روز طلب کرتی ہے مجھ سے مجھ کو
اور میں ہاتھ جھٹکتی ہوں گزر جاتی ہوں

ذرا سی دیر طبیعت بحال رہنے دے
میں یوں ہی خوش ہوں مجھے پُر ملال رہنے دے

خبر نہیں کہ غلط کیا ہے اور کیا ہے درست
دِلا ! یہ عشق ہے تو قیل و قال رہنے دے

یہاں پہ حرکتِ معکوس کا ہے دخل بڑا
اِسی لیے مجھے وقفِ زوال رہنے دے

کسے ہے ظرفِ تمنا کی وسعتوں کی خبر
میں ہجر مانگ رہی ہوں وصال رہنے دے

رمیدہ خواب کسی چشمِ نم میں ٹھیر سکیں
بنامِ وحشتِ دل اک غزال رہنے دے

کسی نشاط کے لمحے کو کب ہے لکھنا مجھے
تو عیشِ ہجر سے مجھ کو نڈھال رہنے دے

نہ کر وضاحتِ تمثیلِ رقصِ کارِ جنوں
مجھے سمجھنا ہے تو بے مثال رہنے دے

تو میرے عشق کے کوزے کو توڑ دے لیکن
بس ایسا کر کہ مرے خدوخال رہنے دے

تو اک پیادے کو شہ مات دینا چاہتا ہے!
میں ہار مان گئی اپنی چال رہنے دے

زندگی کس ڈگر پر اٹھا لائی ہے مائے نی
دکھ کا جنگل ہے اور میری تنہائی ہے مائے نی

ہو بُرا میری آنکھوں کا غم کیوں چھپاتی نہیں
ساری دنیا ہی میری تماشائی ہے مائے نی

اب تو نظارگی کی مجھے کوئی خواہش نہیں
پھر بتا کاہے آنکھوں میں بینائی ہے مائے نی

زخم دل میں ، تمنا بدن میں سجی رہ گئی
اک دریچہ ہے اور ایک انگنائی ہے مائے نی

آج بیلے کی کلیوں نے آنکھوں کو نم کر دیا
میری خوشبو سے کیسی شناسائی ہے مائے نی

لمس پوروں کا ماتھے پر کیسا چمکنے لگا
آرسی میں جو صورت نظر آئی ہے مائے نی

عشق نے تربیت کی سنورنا مجھے آ گیا
سادگی میں بھی اب میری زیبائی ہے مائے نی

اس جبیں پر نظر اک پڑی اور پھر یوں ہوا
جو چمکتی رہی تھی وہ گہنائی ہے مائے نی

اب مجھے ڈھونڈنے کوئی ساحل پہ جائے نہیں
دل سمندر کی بے انت گہرائی ہے مائے نی

ہجر کا پلّو اڑتا جائے یادوں کی پروائی سے
سوندھی سی اک خوشبو اُٹھے بارش میں انگنائی سے

دل دروازے کنڈی لگا کے ابھی لوٹ کے آئی تھی
من ڈیوڑھی ویران لگی پھر اس اپنی تنہائی سے

پھولوں کی اک سیج پہ باسی خوشبو رہ گئی یادوں کی
بھور سمے حیران ہوئی میں خوابوں کی رسوائی سے

دامِ زلیخا سے تو اس نے مات بھی کھائی جیتا بھی
لیکن کون بچا پایا یوسفؑ کو اُس کے بھائی سے

من آنگن بس گھڑی گھڑی میں آرتی اس کی اتارتی ہوں
ایک پجارن دل مندر آباد رکھے ہرجائی سے

ایک طرف ہے بیری دنیا دوجے جانب عشق کی نار
ساتھی کیسے خود کو بچاؤں اس پانی اُس کھائی سے؟

رات اماوس کی ہے پھر بھی نیناں چنداں کھوجے ہیں
شبدوں بھید بھرا وہ مکھڑا جھانکے ہے بینائی سے

آج سہاگ جو گانے بیٹھی انکھیاں میری بھر آئیں
انسوَن کے دھاگے سے لاگے ناتا ہے شہنائی سے

تیتری بھاگ کے پھولوں سے رس چوس کے میرے ہاتھ لگی
پوروں پوروں رنگ اتر آیا اس کی رعنائی سے

عقل کی تھال میں فکر کے گجرے میں نے گوندھ کے جب رکھے
چنچل مورکھ کہتا رہا ، کیا کام تجھے دانائی سے

بے طلب کر کے ضرورت بھی چلی جائے اگر
ڈر رہی ہوں کہ یہ وحشت بھی چلی جائے اگر

شام ہوتے ہی ستاروں سے یہ اکثر پوچھا
شام ہونے کی یہ صورت بھی چلی جائے اگر

اک ترا درد سلیقے سے سنبھالا لیکن
دیدۂ تر سے طراوت بھی چلی جائے اگر

یہ تو ہے خونِ جگر چاہیے لیکن اے دل
شعر کہنے کی رعایت بھی چلی جائے اگر

میں تو حیران پریشان یہی سوچتی ہوں
آئنہ خانے سے حیرت بھی چلی جائے اگر

اک نظر بھر کا ہی سودا چلو منظور ہمیں
کم نگاہی کی یہ مہلت بھی چلی جائے اگر

وہ گیا ہے تو مجھے کام ہی اب کوئی نہیں
کیا ہی اچھا ہو کہ فرصت بھی چلی جائے اگر

دل کے ملبے میں تمنا نے یہ حسرت سے کہا
کیا ہو تعمیر کی حسرت بھی چلی جائے اگر

تیری فرقت بڑی دشوار مگر ایسے میں
یاد کرنے کی سہولت بھی چلی جائے اگر

اب نشاطِ غمِ فرقت سے سوال اتنا ہے
تعزیہ داری کی لذت بھی چلی جائے اگر

برف موسم میں تو شدت ہے تری خواہش کی
اس بدن سے یہ حرارت بھی چلی جائے اگر

❁

یہی بُجھا ہوا لہجہ گواہ ہے میرا
چراغِ فکر جلایا تھا فی سبیل اللہ
بنامِ امن ترا نام لینے والوں نے
بڑا فساد مچایا ہے فی سبیل اللہ

جیسے خوشبو کو سلیقے سے صبا لے جائے
کوئی ایسے ہی مجھے مجھ سے چھڑا لے جائے

مرحلہ وار بکھرتی ہی گئی ہوں خود میں
اب جدھر چاہے ہوا مجھ کو اڑا لے جائے

جاذبیت ہے بڑی رونقِ دنیا تجھ میں
اک غزال آئے مجھے سب سے بچا لے جائے

ہائے وہ گرمیِ بازارِ تمنا کہ مجھے
ہر طلب خواب کے ناقے پہ بٹھا لے جائے

اب وہ چہرہ نہ خد و خال ہیں باقی میرے
کوئی تصویر سے سب رنگ چرا لے جائے

روز آتا ہے مری خلوتِ جاں میں کوئی
یاد کی بھیڑ میں چپکے سے اٹھا لے جائے

حُسن مرہونِ تماشائے تمنا اُس کا
جو کہ ہاتھوں سے مرے رنگِ حنا لے جائے

چاک دامانِ تمنا کے بکھرنے نہ دیے
یوسفِ دل تجھے تہمت سے بچائے رکھا

زادِ سفر سمیٹئے ، خیمۂ جاں اُٹھایئے
ڈوب چلا ہے آفتاب، آپ بھی گھر کو جایئے

مغزِ سخن کے واسطے آنکھیں خیال بن گئیں
اب مری سرگزشت کو دیکھ کے ہی سنایئے

حیف بقدرِ تشنگی کچھ بھی نہیں شراب میں
آپ بجائے جام کے پیاس مری بڑھایئے

آپ تو جانتے ہیں یہ نسبتِ مے کدہ نہیں
آپ شراب پیجیے چائے ہمیں پلایئے

سکۂ صبر جیب میں ہم نے رکھا سنبھال کے
آپ دکانِ درد سے زخم نیا منگائیے

تیشۂ مصلحت نے تو جرأتِ قیس چھین لی
لیلائے شوق چل بسی فرشِ عزا بچھائیے

دامِ دلِ ستم گراں جوش و خروشِ جاوداں
عشق کی راہ میں سدا اپنے تئیں مٹائیے

کارواں ہائے تمنا تو نہیں ٹھہریں گے
تم یونہی محملِ حسرت کو بھٹکنے دینا

حبس جب حد سے بڑھا جسم کے ویرانے میں
روح نے بین کیا دل کے عزا خانے میں

ہائے وہ رنگ جو ابھرا میری بے دھیانی سے
ہائے وہ نقش جو بنتا گیا ان جانے میں

اب کوئی حرف و معانی کی خبر کیا لائے
اب کہانی ہی کہاں ہے مرے افسانے میں

کوئی گتھی نہ کُھلی ایک بھی عقدہ نہ کھلا
مسئلہ اور الجھتا گیا سلجھانے میں

کیسی خود روٹھی تری یاد جو آتی ہی رہی
در و دیوار دھڑکنے لگے کاشانے میں

تاکِ امید سے پیمانۂ فردا خالی
تشنگی بٹنے لگی ہے ترے مے خانے میں

فصلِ گل میں بھی ترا چاک گریباں نہ ہوا
کوئی آشفتہ مزاجی نہیں دیوانے میں

❁

کتنے پُر ماجرا تھے روز و شب
ہم بہت دیر تک سنے گئے تھے

عروسِ ہجر ترا انتظام ہونے کو ہے
سنور رہی ہے تری یاد شام ہونے کو ہے

ہوائے شہرِ تمنا بجھا کے چھوڑے گی
چراغ جانتے ہیں ان کا کام ہونے کو ہے

میں نکتہ دانِ محبت سے کیا کہوں آخر
حکایتِ دل و دنیا تمام ہونے کو ہے

دعا کے کاسے کو خود ہی الٹ دیا میں نے
مری کہانی کا اب اختتام ہونے کو ہے

بنے گی صاحبِ جاگیر بے گھری اپنی
کہ ایک کتبے پہ اپنا بھی نام ہونے کو ہے

سکوتِ ذات یہ مشقِ سخن رہے جاری
سُنا ہے کوہِ ندا سے کلام ہونے کو ہے

اسیرِ خواہشِ دنیا تجھے خبر ہی نہیں
عجب طرح سے زمانہ غلام ہونے کو ہے

ایک اک گام پہ اپنے کو سنبھالے ہوئے میں
ایک اک بات پہ ہاتھوں سے نکلتا ہوا دل
ذرّے ذرّے سے دھڑکنے کی صدا آتی ہے
دشت کی ریت کے مانند بکھرتا ہوا دل

تری نگاہ کا لہجہ خیال میں آ کر
مرے لہو کی روانی میں گونجتا ہے بہت

❁

وہ عہدِ خواب کی تجدید کرنے لگتا تھا
میں جاگتی رہوں تاکید کرنے لگتا تھا

عجب حریف ملا تھا بہ صورتِ ہمدَم
جو میرے ہونے کی تردید کرنے لگتا تھا

فسانہ جب کسی انجام کی طرف بڑھتا
نئے سرے سے وہ تمہید کرنے لگتا تھا

وہ آئنہ تھا مرے عکس کے سنورنے تک
ہر ایک بات پہ تنقید کرنے لگتا تھا

رموزِ حرف سے آگاہ جب قلم ہوتا
تو شعر کہنے کی تائید کرنے لگتا تھا

❁

وحشت رفتہ رفتہ مجھ میں خاک اڑا کے بیٹھی ہے
خاموشی دھڑکن کی صورت شور مچا کے بیٹھی ہے

اک اک رسم نبھائی ایسے صبح و شام میں ہانپ گئی
زیست ترنت گڑیا گڈے کا بیاہ رچا کے بیٹھی ہے

رات تمناؤں کے زیور تن پر میرے سجتے رہے
صبحِ حسرت من کو نیا گہنا پہنا کے بیٹھی ہے

چوبِ جاں سے دیر تلک کل رات دھواں اٹھتے دیکھا
خیمۂ دل کو ایک تمنا آگ لگا کے بیٹھی ہے

موجۂ وقت طلب کا دریا سوکھنے دے آواز نہ دے
بے کس ماں پیاسے بچے کو ابھی سُلا کے بیٹھی ہے

شورِ دیوار و در سے بچنے کی خاطر شام ڈھلے
تنہائی خاموشی سے کھڑکی میں جا کے بیٹھی ہے

شمعِ گریہ قطرہ قطرہ نور گرا دل کے اندر
چشمِ نم دیدار کی خاطر اشک بچھا کے بیٹھی ہے

خاک ہو اس دنیا پر جس میں کچھ بھی ہاتھ نہیں آتا
کوکھ تمنا کی اپنا بچہ دفنا کے بیٹھی ہے

تارِ نفس کا ایک سرا بھی تیرے ہاتھ نہیں آیا
جو ریشم سلجھانا تھا اس کو الجھا کے بیٹھی ہے

❁

خیمے لگتے ہیں اور اکھڑتے ہیں
دشت پر کچھ اثر نہیں پڑتا

شور اندر جو ہے برپا وہ صدا ہو نہ سکا
لفظ زنجیرِ معانی سے رہا ہو نہ سکا

بات چوکھٹ سے جو نکلی تو جبیں تک پہنچی
پھر جو سجدہ مجھے کرنا تھا ادا ہو نہ سکا

اتنی سی بات میں سمٹی تھی کہانی ساری
اُس کی میں ہو نہ سکی اور وہ مِرا ہو نہ سکا

ہر صنم خانے کی قسمت نہیں کعبے جیسی
دل میں جو بت تھا سجایا وہ خدا ہو نہ سکا

عالمِ کُن میں رہا شور مِرے ہونے کا
پھر کوئی حادثہ مجھ سے بھی نیا ہو نہ سکا

تہمتِ عہدِ تمنا ہے لگائی اس نے
آج تک جس سے کوئی عہدِ وفا ہو نہ سکا

مرا وجود بھی میرا وجود ہے کہ نہیں
عدم کے آئینے پر نقش بن گیا کیوں کر؟
میں اپنی آنکھ کی تصویر گر ہٹا لوں تو
نِگار خانۂ عالم ہے کیا سوائے نظر؟

یہاں جو رہتا تھا پہلے وہ کیا چلا گیا ہے؟
صنم کدے سے نکل کر خُدا چلا گیا ہے

میں خالی ہاتھ بس اب آسماں کو تکتی ہوں
دعا کے ساتھ ہی حرفِ دعا چلا گیا ہے

اب اس لیے کسی تعبیر کی لگن نہ رہی
خیال و خواب سے وہ ماورا چلا گیا ہے

تو اپنے زخمِ شناسائی کو سنبھال کے رکھ
تجھے خبر نہیں درد آشنا چلا گیا ہے

خرد کرے نہ تقاضا ، جنوں کرے نہ طلب
اب آرزو کا ہر اک سلسلہ چلا گیا ہے۔

رہینِ فصلِ بہاراں نہیں ہے دستِ طلب
ہمارے ہاتھ سے رنگِ حنا چلا گیا ہے

بگولے خانۂ وحشت میں کر رہے ہیں طواف
کہ قیس دشت سے نامِ خدا چلا گیا ہے

❁

اوقات سے باہر نہیں ہونے دیا خود کو
اک دشت سجا رکھا ہے وحشت کے برابر
زنجیرِ خرد رقصِ جنوں کرنے دے مجھ کو
مٹی ہے مری جذب کی حالت کے برابر

❁

مجھ کو خود میں قیام کرنا تھا
ورنہ رستے پڑے تھے قدموں میں

❁

دشمنِ جاں نے مری ایسی نگہ داری کی
دل نے اسبابِ گرفتاری کی تیاری کی

تیغ کے ساتھ ہی قدموں پہ ترے آ کے گرا
سر نے ہر حال میں قاتل کی طرف داری کی

میں نے کردارِ محبت کی وضاحت مانگی
اور اس شخص نے مرنے کی اداکاری کی

ایک سگریٹ سے دھواں اٹھتا رہا کمرے میں
اور تصویر سی بنتی رہی دشواری کی

دل کے خانے میں کوئی چیز سلامت نہ رہی
اس نے ترتیب الٹ دی مری الماری کی

سوئی کے ناکے سے ہاتھی بھی گزر سکتا ہے
جس کو آ جائے سمجھ عشق کی یہ باریکی

ایک زنجیر کھنک دار جو قدموں پہ گری
پھر خبر عام ہوئی خود ہی گرفتاری کی

کاسۂ حسنِ تمنا کو بڑھائے رکھا
عمر بھر عشق نے کچھ ایسی فسوں کاری کی

❁

تو نے اے موجِ ہوا! کیسا مٹایا اس کو
وہ تو پانی پہ بنائی ہوئی تصویر لگا

وہ دکانِ طلب کو سجاتے رہے اور تمنا کا بازار ہم بن گئے
جب ہمیں اپنی قیمت نہیں مل سکی پھر خود اپنے خریدار ہم بن گئے

اِک جدائی کا موسم تھا سر پر کھڑا اور پاس اپنے تھا ایک کچا گھڑا
بیچ منجدھار میں ناخدا کون تھا اپنی ناؤ کی پتوار ہم بن گئے

ٹوٹے پھوٹے سے کچھ لفظ لکھتے رہے الٹی سیدھی لکیریں بناتے رہے
سوزِ دل کے سوا کچھ نہیں پاس تھا، لوگ کہتے ہیں فن کار ہم بن گئے

ہجر کی وحشتیں، وصل کی لذتیں، قربتوں میں یہ بڑھتے ہوئے فاصلے
عمر بھر جس کہانی کو لکھتے رہے مرکزی اس کا کردار ہم بن گئے

نرم لہجے میں اب بات کہتے نہیں اور بولے بنا بھی تو رہتے نہیں
کیمیا کا عمل اس طرح سے ہوا پھول تھے اور تلوار ہم بن گئے

❁

اک دردِ آگہی تھا بہت دیر تک رہا
اک زخمِ فکر ایسا لگا جو نہیں بھرا

ہر لمحۂ وجود عدم کی طرف بڑھا
اک سانس کی صلیب پر دم جیسے ہو رکا

اک قربِ رائیگاں نے کہیں کا نہیں رکھا
پھر آپ سے ہی بڑھتا رہا خود کا فاصلہ

اِس دل میں اس کی یاد کا جلتا رہا چراغ
ہر شامِ غم ہمارا یہی مشغلہ رہا

خالی لگی دکانِ طلب اور ایسے میں
بازار سے جو گزرے تو کچھ بھی نہیں ملا

حیرت کدے سے لوٹ کے آتے بھی کس طرح
آنکھوں کے بدلے پُتلی میں تھا آئینہ جڑا

سارے رشتے تھے آزمائے گئے
ہم بھی تقسیم ہو کے لائے گئے
کیا خبر کون بڑھ گیا دل میں؟
کیا پتا ہم کہاں گھٹائے گئے؟

ایک کردار کہانی کے حوالے کر کے
حرف کو ڈھونڈا معانی کے حوالے کر کے

سارے منظر وہ مرے لے گیا جاتے جاتے
آنکھ کو اشک فشانی کے حوالے کر کے

امتیازِ من و تو کیسا مٹایا گیا ہے
پیاس کا ذائقہ پانی کے حوالے کر کے

مجھ کو بازار میں لے آئی تمنائے خرید
جنسِ دل تجھ کو گرانی کے حوالے کر کے

ساحلِ وقت مرے دامنِ تر سے نہ الجھ
مجھ کو دریا کی روانی کے حوالے کر کے

وحشتِ دل نے بہت دیر تماشا دیکھا
خود کو آشفتہ بیانی کے حوالے کر کے

پھر ازل تا بہ ابد لذتِ آزار سہی
حُسن اور عشق جوانی کے حوالے کر کے

روح کے ذائقے رکھے تھے بدن میں لیکن
جسم کو عالمِ فانی کے حوالے کر کے

محشر آثار ہوئی جاتی ہے ہستی میری
چٹکی بھر خاک نشانی کے حوالے کر کے

❁

ہماری تابِ پر و بال ناپنے والے
اڑان بھر کے لیے آسمان کم نکلا

کسی سے بھی مری وحشت سنبھل نہیں پائی
میں شمعِ دشتِ تمنا تھی جل نہیں پائی

پلٹ پلٹ کے نگہ دار ہی کو تکتی رہی
جو آرزو مرے سینے میں پل نہیں پائی

عجیب عجلتِ کارِ سفر کا سامنا تھا
سو میں لباس بھی اپنا بدل نہیں پائی

میں ایک شامِ الم اور تو ہے صبحِ طرب
اسی لیے ترے سانچے میں ڈھل نہیں پائی

عجیب حبسِ تمنا کی تھی ، گھٹن دل کی
ہوائے شام بھی اس شام چل نہیں پائی

حیات صحبتِ نامہرباں سے بچ نہ سکی
شکستِ جسم کی ساعت تھی ٹل نہیں پائی

اسیرِ مرکزِ تہذیب تھی تماشا بنی
ادب کے دائرے سے میں نکل نہیں پائی

تمام عمر مجھے جس نے جگمگایا تھا
میں اس کی خاک بھی چہرے پہ مل نہیں پائی

اب تو مرے افکار کو دے اذنِ تکلّم
جبریلِ خیالات کے پر جلنے لگے ہیں

ہوائے شام چلے تو بکھرنے لگتی ہوں
میں دشتِ دل سے سمٹ کر گزرنے لگتی ہوں

ازل سے تا بہ ابد ایک لمحہ میرا ہے
تری نگاہ میں جس دم ٹھہرنے لگتی ہوں

نظر کے لمس سے رنگِ بدن چھپاتی رہی
میں تتلیوں کی طرح کیوں کہ مرنے لگتی ہوں

ملی فراق کے آئینے میں پناہ مجھے
وصالِ حرف میں ڈھل کر سنورنے لگتی ہوں

ورق پہ سادہ تمنا کے خال و خد ہیں مگر
میں سوچ کر تجھے کچھ رنگ بھرنے لگتی ہوں

جب آ گہی کے خد و خال دیکھتی ہوں کبھی
تو اپنے حسنِ تحیّر سے ڈرنے لگتی ہوں

اگر تو وعدہ نبھاتا نہیں تو اس لمحے
میں اپنے آپ سے بھی خود مکرنے لگتی ہوں

سگانِ کوچہ بہت شور کرنے لگ گئے تھے
سو ہم نے گھر میں ہی رہنے کا فیصلہ کیا ہے

عجیب طور سے وہ آزمانا چاہتا ہے
بنامِ عشق تماشا بنانا چاہتا ہے

ہے اک اندھیری حویلی میں راکھ خوابوں کی
اُسے یہ ضد کہ مجھے جگمگانا چاہتا ہے

میں تھک گئی ہوں تقدس کے بوجھ سے لیکن
کوئی مزار پہ چادر چڑھانا چاہتا ہے

میں اپنے آپ سے بھی اجتناب کرتی ہوئی
وہ دل کے راستے مجھ میں سمانا چاہتا ہے

گئے دنوں کی شباہت ہے اس کے لہجے میں
زبانِ حال سے ماضی میں لانا چاہتا ہے

گریز کرتے ہوئے دن اداس سی راتیں
یہ ہجر کتنا مجھے والہانہ چاہتا ہے

میں آئنے سے مگر بے سبب الجھ رہی ہوں
وہ میرے عکس سے باتیں بنانا چاہتا ہے

قبول ورَد کی نہیں بات، دل کی بات ہے یہ
وہی تو چاہتی ہوں جو زمانہ چاہتا ہے

مِری غزل سے وہ دامن بچا گیا اپنا
وہ خود پرست بس اپنی سنانا چاہتا ہے

بے گھری رہتی ہے یا در بدری رہتی ہے
دل خرابے میں تو اب نوحہ گری رہتی ہے

اس کی خوشبو کی خبر کیسے بھلا لائے صبا ؟
وہ جہاں ہے وہاں تو بے خبری رہتی ہے

تم کو معلوم نہیں میرا ٹھکانا شاید
ساتھ آہن کے مری شیشہ گری رہتی ہے

کبھی محرومِ تماشا نہیں ہونے دیتی
آئنے تجھ میں جو یہ دیدہ وری رہتی ہے

شجرِ دل پہ کوئی فصل بھی آئے لیکن
عشق پیچاں کی سدا بیل ہری رہتی ہے

جس جگہ دشت میں رہتے تھے کبھی اب تو وہاں
لوگ کہتے ہیں کہ آشفتہ سری رہتی ہے

جب زوال آیا تو لوگوں نے مجھے پہچانا
مجھ ہنرمند میں بھی بے ہنری رہتی ہے

دیے کی لَو نے لرزتے ہوئے کہا مجھ سے
ہوائے ہجر چلی ہے سنبھالنا دل کو

صبح بے نور ہے، شام بے کیف ہے، کیسی حالت میں ہے مبتلا زندگی
روز و شب میں کہاں لطف باقی رہا، ایسے جینے میں کیا ہے مزا زندگی

موج میں آ کے دامن جھٹکتی رہی اور تشنہ لبی میری بڑھتی رہی
تشنگی نے جو دریا دلی سیکھ لی، کس سے کہتی میں کیا ہو گیا زندگی

درد سہتی رہی شعر کہتی رہی، کیسے ارزاں تھے غم داد لیتی رہی
زخم سینے سے کاغذ پہ کب آ سکا، کس کو گہرائی کا ہے پتا زندگی

بود و نابود سب کچھ فریبِ نظر، اس سے بچ کے مگر کوئی جائے کدھر
اس وجود و عدم کے تماشے میں اب یاد آنے لگا ہے خدا زندگی

ہجر اور وصل سے ماورا سلسلہ ، قربتوں میں بھی بڑھتا رہا فاصلہ
عشق کی جاودانی فنا کر گئی ، جیتے جی ہو گئی پھر جُدا زندگی

اک چمن تھا کہ جس میں صبا آتی تھی ، میری زلفوں کی خوشبو کو لے جاتی تھی
جس نے مصروفِ فصلِ بہاراں رکھا ، مجھ میں زندہ جو تھا کیا ہوا زندگی

تیری خاطر تو سمجھوتا خود سے کیا ، جانے کتنے اصولوں کا سودا کیا
میں تو اپنے کو بھی خوش نہیں رکھ سکی ، پھر بھی تجھ کو ہے مجھ سے گِلہ زندگی

زخم سہنے کی مشقت سے بہت تھک گئی تھی
دردِ وحشت تری اجرت سے بہت تھک گئی تھی
اب یہ سوچا ہے کہ خود میں ہی ٹھہر جاؤں گی
آ گہی روز کی ہجرت سے بہت تھک گئی تھی

تمھارے حُسنِ تغافل سے کچھ گلہ بھی نہیں
نبھا رہی ہوں وہ پیمان جو کیا بھی نہیں

کہا ضرور تھا کچھ اُس نِگاہ نے لیکن
پھر اس کے بعد دوبارہ کبھی کہا بھی نہیں

پھراس کے بعدتو بابِ طلب سےلوٹ آئے
پھراس کے بعد تو اپنے لیے دعا بھی نہیں

وہ اتنا سادہ نہیں ہے کہ جتنا لگتا ہے
جو بات کہہ نہیں پاؤں وہ پوچھتا بھی نہیں

بس اِک نگاہ پہ خوش فہم دل دھڑک اُٹھا
جو سچ کہوں تو کوئی ایسا سلسلہ بھی نہیں

بس ایک پھول ہی بکھرا تھا گرچہ کہنے کو
اب اس سے بڑھ کے مگر کوئی سانحہ بھی نہیں

یہ زخمِ ہجر تو بس جان لے کے جاتا ہے
یہ درد ایسا ہے جس کی کوئی دوا بھی نہیں

کیوں خاک اڑ رہی ہے تری کارگاہ میں
اے کوزہ گر ! سمیٹ لے اپنی پناہ میں
دستِ ہنر ہی کوئی دکھائے گا اب کمال
ہم لُٹ کے آگئے ہیں تری بارگاہ میں

چشمِ ادراک کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ اب
درو سن سکتے ہیں خوشبو کو پکڑ سکتے ہیں

❁

(عرفان صدیقی کی نذر)

لوگ بازار میں پھرتے ہیں ضرورت کے بغیر
دل اسی واسطے بِک جاتا ہے قیمت کے بغیر

میں ادھوری ہی رہی عشق بھی پورا نہ ہوا
عالمِ کُن ہے یہ تکمیل کی صورت کے بغیر

ہر تمنا کے بگولے سے صدا آتی ہے
"آپ کیوں آئے تھے اس دشت میں وحشت کے بغیر"

آئنہ خانے سے کچھ بھی نہیں مل پایا مجھے
میں نے جب دیکھنا چاہا کبھی حیرت کے بغیر

کیا عجب طور سے عجلت کا سفر ہے درپیش
لوگ اٹھ کر چلے جاتے ہیں اجازت کے بغیر

دل خرابے کے لیے خود کو بنا بھی نہ سکی
خاک تعمیر کروں؟ خاک کی حسرت کے بغیر

ایک شمع جلی اور جل کر بجھی
قِصّہٗ زندگی مختصر مختصر
پیاس اتنی مفصل بتا نہ سکوں
اور ساقی گری مختصر مختصر

کس سہولت سے ان کہی ، کہی ہے
زخم لکھا ہے ، شاعری سہی ہے!

ایک مشکیزہ چِھد گیا اور پھر
موج در موج تشنگی یہی ہے

خواب تعبیر سے بچھڑ نہ سکے
دیدۂ تر میں روشنی وہی ہے

آرزو ہے نہ مدعا کوئی
دامنِ شوق کس قدر تہی ہے

روز و شب بس یونہی گزر رہے ہیں
کیسے کہہ دوں کہ زندگی یہی ہے

آنکھ میں خواب دھول جھونک گئے
دل میں ہر سمت خاک اڑ رہی ہے

❁

خود فراموشی آبلہ پائی
کس طرف جانا تھا کدھر نکلے
ایک مجذوب خوش ہوا مِل کر
ہم تو خود سے بھی بے خبر نکلے

وہ نیند تھی کہ نہ کوئی اذان سے اٹھا
یقیں کا شور سکوتِ گمان سے اٹھا

نگاہِ ناز سے میں دوستوں کو دیکھتی تھی
عدوئے جان کوئی درمیان سے اٹھا

بہت دنوں رہا طاری سکوتِ پیہم پھر
عجیب شور ہمارے مکان سے اٹھا

پروں کو تول رہے تھے اڑان کی خاطر
شکاری تیر سنبھالے مچان سے اٹھا

یہیں کہیں کسی چوکھٹ پہ خواب بکھرے تھے
یہیں پہ دل کا جنازہ بھی شان سے اٹھا

زمین تو نے اٹھایا تھا کس طرح سے اُسے
جو نور بڑھتا ہوا آسمان سے اٹھا

فصلِ خواہش ہے محوِ بدن ان دنوں
ہم ترے ہجر میں ہیں مگن ان دنوں
تیری فرقت ہے مصرعے اگاتی ہوئی
کتنا سر سبز ہے یہ چمن ان دنوں

سارا عالم تری خلوت میں گنوا بیٹھے ہیں
عکس ہم آنکھ کی حیرت میں گنوا بیٹھے ہیں

اب کسی اور سفر کے لیے قائل نہ کرو
زندگی ساری مسافت میں گنوا بیٹھے ہیں

ایک دھڑکا ہی رہا تجھ سے بچھڑ جانے کا
وصل کو وصل کی حالت میں گنوا بیٹھے ہیں

دشتِ امکان میں ہر سو ہیں بگولے اٹھتے
دلِ وحشی تجھے وحشت میں گنوا بیٹھے ہیں

تجھ سے تو قرضِ تمنا بھی ادا ہو نہ سکا
نقدِ دل تیری ضرورت میں گنوا بیٹھے ہیں

چند یادوں کو پس انداز کیا تھا لیکن
خودفراموشی کی عادت میں گنوا بیٹھے ہیں

❁

بہت دنوں رہا خود سے مکالمہ میرا
اب اس کے بعد کہیں جا کے آ گہی ہوئی ہے
سراب ، تشنہ لبی ، آرزو ، فریبِ نظر
ہمارے ساتھ یہ لگتا ہے دل لگی ہوئی ہے

بدگمانی کے جزیرے سے نکالے مجھ کو
سرد مہری یہ تری مار نہ ڈالے مجھ کو

ڈوبنے پر نہیں حیرت مگر افسوس ہے یہ
اس نے کیسے کیا طوفاں کے حوالے مجھ کو

خاک ہونے کو میں آئی ہوں مرے کیمیا گر
آزماتے ہی رہے چاہنے والے مجھ کو

کثرتوں میں کہیں وحدت ہی بکھر کر رہ جائے
اے خدا! ٹوٹ نہ جاؤں میں، بچالے مجھ کو

ہار اور جیت کے اس شوق میں دنیا تیری
کہیں ایسا نہ کرے کھیل بنالے مجھ کو

اپنی مٹّی کو سمیٹے ہوئے یہ سوچتی ہوں
کون سی چیز نے رکھا ہے سنبھالے مجھ کو

❁

بابِ انصاف پر آنکھ پتھرا گئی
فیصلہ ، فیصلہ ، فیصلہ ، فیصلہ
عشق کی راہ میں ہم سفر کون تھا
حوصلہ ، حوصلہ ، حوصلہ ، حوصلہ

اپنی آشفتہ مزاجی کو اٹھا لے گئے ہیں
بہ سبب چند سوالوں کے نکالے گئے ہیں

اے مرے دوست! تری دیدہ وری کی خاطر
عکس اور آئنے محفل میں اچھالے گئے ہیں

اُن سے مت جنگ کے اسباب و مقاصد پوچھو
وہ تو بس شوقِ شہادت ہی میں پالے گئے ہیں

کل یقیں اور گماں میں چھڑی گھمسان کی جنگ
بس خدا کو بڑی مشکل سے بچالے گئے ہیں

کاسۂ دل کی قناعت کا نہ عالم پوچھو
چند منظر مرے کشکول میں ڈالے گئے ہیں

اس آئینے سے نکل اور خود کو تنہا کر
کبھی تو سامنے آ کر کوئی تماشا کر

میں دور ہوتی چلی جا رہی ہوں مرکز سے
مجھے سمیٹ مرے دائرے کو چھوٹا کر

ہجومِ کذب و ریا سے بچا لے آ کے ذرا
وجودِ صدق و صفا میں مجھے اکیلا کر

ہر ایک بات بیاں کرنے کی نہیں ہوتی
جو ان کہی رہے اس بات کو بھی سمجھا کر

نہیں ہے کچھ بھی من و تو کا امتیاز یہاں
خود اپنی ذات سے باہر نکل کے سوچا کر

ہست و موجود کبھی بے خبری ایسی ہو
سب ہی معدوم لگے دیدہ وری ایسی ہو

بود و نابود کا آشوب نہیں رکنے دے
خاک اڑتی ہی رہے در بدری ایسی ہو

بیش از بیش ہو پتھر کا نشانہ لیکن
کم سے کم ٹوٹ سکے شیشہ گری ایسی ہو

در و دیوار سے ماتم کی صدائیں گونجیں
دل عزاداری کرے نوحہ گری ایسی ہو

وحشتِ عشق جو ٹھہرے تو جنوں رقص کرے
اب مری خاک میں آشفتہ سری ایسی ہو

سر ہتھیلی پہ لیے لوگ چلے آئیں خود
دستِ قاتل تری بیداد گری ایسی ہو

آئنہ رقص میں، تصویر مری رقص میں ہے
پاؤں کے ساتھ ہی زنجیر مری رقص میں ہے
کوزہ گر چاک پہ مٹی کو ملی تھی گردش
پھر میں کیسے رکوں تعمیر مری رقص میں ہے

ہمیں لکھا بھی اگر حاشیے میں رکھا گیا
نظر نہ آئے جو اس زاویے میں رکھا گیا

ترے نصیب میں منزل کبھی نہ آئے گی
سفر تمام ترا دائرے میں رکھا گیا

ہوا کو یہ بھی بتایا کہ روشنی ہے کہاں
چراغ کو بھی ترے راستے میں رکھا گیا

انا کے نام پہ جب بن گیا صنم خانہ
خدا کو لا کے وہاں بت کدے میں رکھا گیا

ہوا یہ حال کہ بے حال ہو گئے ہم تو
بنامِ عشق عجب سلسلے میں رکھا گیا

عجیب ساعتِ دیدار تھی نگاہوں میں
سجا کے حیرتوں کو آئنے میں رکھا گیا

کوئی بیان دیا نہ کوئی صفائی دی
ہمارا نام مگر فیصلے میں رکھا گیا

درد ہوا نہیں طلوع زخم چمک نہیں سکا
کیسی عجیب صبح تھی کیسی غریب شام تھی

بات جو اب تلک نہ کی اس کو کبھی ذرا سمجھ
دستِ طلب بڑھا نہیں پھر بھی تو مدعا سمجھ

یہ ہے جہانِ آب و گل کچھ بھی نہیں سوائے دل
میں ہوں جہاں وہاں نہیں پھر بھی مرا پتا سمجھ

اُس کا پیام روز ہی بادِ صبا سناتی ہے
عقل سے کام لے ذرا تو ہے بڑا ہی نا سمجھ

سجدے ہزار کر لیے پھر بھی یہ دل جھکا نہیں
خود کو تو پہلے بھول جا ، آئے گا پھر خدا سمجھ

تجھ کو رموزِ عاشقاں خود ہی سمجھ میں آئیں گے
عشق میں جسم و جان سے اپنے کو ماورا سمجھ

کون سی منزلِ مراد کون سا مقصدِ حیات
ہونے کو ہے سفر تمام آیا نہ راستہ سمجھ

ہمارا رنگِ خد و خال پوچھنے والے
بتائیں کیا تمھیں احوال پوچھنے والے
کسی چراغ کدے کا دھواں بھی دیکھا کر
وضاحتِ شبِ تمثال پوچھنے والے

۞

ہمیں جو کچھ دکھایا جا رہا ہے
پسِ پردہ تماشا دوسرا ہے

بہت انصاف کا چرچا سنا تھا
مگر سب ظلم ہی کا ماجرا ہے

مجھے محدود کردے دائرے میں
مرا مرکز سے رشتہ کٹ رہا ہے

صدائیں کھوگئیں ساری فضا میں
کوئی خاموش لہجہ گونجتا ہے

زوال آمادہ ہے گھر کا ادارہ
یہی تہذیب کا کیا ارتقا ہے

مکمل ہی نہیں میری اکائی
جدھر دیکھو مرا حِصّہ بنا ہے

مجھے میلے سے آخر کیا ملے گا
مرے جب گھر کا رستہ کھو گیا ہے

❁

میں اپنے آپ سے وعدہ وفا نہ کر پائی
مرے مزاج کا کوفہ مری تلاش میں تھا

کسی نے پوچھا جو عمرِ رواں کے بارے میں
تو کیا بتائیں گے سود و زیاں کے بارے میں

حریمِ دیدہ وری ! خاک اڑ رہی ہے مری
میں جانتی تھی غبارِ مکاں کے بارے میں

نجانے کیسی گزرتی ہے جانے والوں پر
کوئی بتاتا نہیں رفتگاں کے بارے میں

دعا کرو کہ سلامت رہے مرا پندار
زمیں پہ سوچتی ہوں آسماں کے بارے میں

نجانے کتنے حریفوں کے نام یاد آئے
میں لکھ رہی تھی صفِ دوستاں کے بارے میں

ہر ایک قصّے پہ دل اپنا تھام تھام لیا
جو واقعات سنے داستاں کے بارے میں

یقین کر کہ ابھی تک ہے دل کو اس پہ یقیں
یہ حسنِ ظن ہے کسی بدگماں کے بارے میں

فریبِ سادہ دلی دیکھ اس ستم گر نے
بیان راز کیا رازداں کے بارے میں

ہم خاک نشیں لوگ ہیں منصب سے نہ پہچان
جس جا پہ ٹھہر جائیں وہی تخت ہمارا

❁

قرار سے مجھے رکھتی ہے بے کلی میری
نشاط گریۂ جاناں ہے زندگی میری

اسی میں ہے غمِ فرقت اِسی میں نالہِ دل
یہ میرا مجھ کو ہی پُرسہ ہے شاعری میری

کبھی میں یادوں کی بیڑی کے ساتھ چلتی رہی
کبھی دعائیں بھی کرتی تھی ہتھکڑی میری

خدایا! چشمۂ فیضانِ عشق ہو جاری
رگڑ رہی ہے بہت ایڑیاں خودی میری

میں سارے رنگ گزشتہ دنوں کو سونپ آئی
اب آئنے تجھے سہنا ہے بے رخی میری

غزل بھی لکھی لحاظِ جمال بھی رکھا
یہی زیادتی میری یہی کمی میری

ہائے مغرورِ طرب تجھ کو خبر کیسے کریں
دل میں ہوتا ہے سرِ شام سے رقصِ وحشت
دائرہ وار ہے ویرانیِ ہجرت کا نشہ
اور ٹپکتا ہے ہر اک جام سے رقصِ وحشت

جہاں پر خاک اڑتی ہے وہیں پر
کسی کا چھوٹا سا عشرت کدہ تھا

تمثیلِ وفا کی یہاں شہرت تو نہیں ہے
یہ دل ہے کوئی مالِ غنیمت تو نہیں ہے!

کتنے ہی مواقع تھے جہاں چپ ہی رہے ہم
وہ پوچھا کیے کوئی شکایت تو نہیں ہے؟

یہ ہجرِ مسلسل ہے نہیں وصلِ معین
اس زخم کو بھر جانے کی عادت تو نہیں ہے

ہے چاک گریبانِی گفتارِ معانی
معلوم کریں قیس سے نسبت تو نہیں ہے؟

کیوں آپ بھی آمادۂ تکرار ہیں حضرت
اس کفر میں ایمان کی شدت تو نہیں ہے؟

دل میں ہے کہاں قطرۂ یک خونِ تمنا
سب کچھ ہے مگر دشت میں وحشت تو نہیں ہے

اک سمت چلے جاتے ہیں رفتارِ جنوں سے
کیا آخری منزل پہ محبت تو نہیں ہے؟

دیوار سے اس شخص نے تصویر ہٹا دی
یہ سوچ کے اب اس کی ضرورت تو نہیں ہے

اس بار میں روٹھی ہوں کہ وہ مجھ کو منائے
تجدیدِ وفا کی جسے فرصت تو نہیں ہے

جس رخ سے بھی چاہے وہ کرے بے رخی مجھ سے
آئینے کی اپنی کوئی صورت تو نہیں ہے

اب طاق پر سجاؤ قناعت سنبھال کے
بازار لے گئی ہے ضرورت سنبھال کے

رہنے دیا حجاب میں ہی رازِ حُسن کو
گویا رکھی گئی ہے قیامت سنبھال کے

اب گنگ ہو چکی ہوں کہوں بھی تو کیا کہوں
محفوظ رکھ سکی نہ سماعت سنبھال کے

آ ہوئے چشمِ ناز نصیحت یہ ہے تجھے
رکھنا تو احتیاط سے حیرت سنبھال کے

کرلے جمالِ دوست کا تو بھی مشاہدہ
خود آگہی میں عشقِ طریقت سنبھال کے

مفہوم آفرینیِ دل ہو چلا ہے شوق
رکھ لے اب استعارہ شباہت سنبھال کے

تنقید کر رہا تھا کوئی خطّ و خال پر
میں محوِ آئنہ ہوئی صورت سنبھال کے

کیسے پلٹ کے حجرۂ دل کی طرف گئی
دنیائے پُر ہجوم سے خلوت سنبھال کے

آیتِ ہجر اترتی رہی دل پر میرے
اور وحشت کے صحیفے کو پڑھا آنکھوں سے

کیسا ہے رمزِ آگہی ایک بھی در نہیں کُھلا
چلتے رہے نہ کم ہوا، خود سے یہ خود کا فاصلہ

لفظ بہت تھے قیمتی وہ تھا مزاج آشنا
عشق میں ہم نے آنکھ سے کام زبان کا لیا

دشتِ سگاں میں منتظر اپنے غزال کی رہی
اس کو مگر خبر نہیں تکتی ہوں اب بھی راستہ

مجھ کو نہ سرسری پڑھو دیکھو سنبھال کر رکھو
میری یہ خاک دیکھنا بنتی ہے کیسے کیمیا

اُس سے کہو کہ چارہ گر تیرا مریضِ جاں بہ لب
اُس سے کہو کہ درد ہی ہونے لگا ہے اب دوا

ذرا تم طاق پر رکھے محبت کے دِیے کو پھر جلاؤ

اندھیرا بڑھ رہا ہے !
اندھیرا بڑھ رہا ہے اور
ہم دونوں کی آنکھیں بھی
ذرا
کم نور ہوتی جا رہی ہیں
اس لیے ایسا کرو
اک بار پھر سے
جو
گزشتہ عہد میں وعدے کیے تھے
محبت کے جو نغمے گنگنائے تھے

وفا کے پھول جو برسائے تھے
وہ
دھیان میں لاؤ
چلو اک بار پھر
دہراتے ہیں خود کو
سنو!
ہم دونوں کی آنکھیں اگر کم نور ہیں تو کیا
دلوں میں یاد کا جشنِ چراغاں ہم کریں
اُس سے کم از کم رات کٹنے کے لیے
کچھ روشنی تو مل سکے گی پھر
چلو ہم طاق پر رکھے محبت کے دیے کو پھر جلاتے ہیں
اداسی سے ہی دونوں مسکراتے ہیں
(ابوظہبی اسپتال، جنوری ۲۰۱۳ء)

گردشِ وقت

عشق کی یہ سلگتی ہوئی آگ اب سرد ہونے کو ہے
کوئی کوزہ بھی اب آتشِ سرد میں پک نہیں پائے گا
راکھ کے ڈھیر میں کوئی چنگاری
اک لمحہ بھڑکے بھی تو
کیا ملے گا ہمیں
کوزہ گر جانتا ہے کہ اب
چاک بھی
گردشِ وقت کے سامنے
اپنی گردش کو کب کا بھلا بیٹھا ہے

اب من و تو کا قِصّہ سنانے سے کیا فائدہ؟

گاہ بہ گاہ
لمحہ بہ لمحہ یہی رِیت ہے
کارگاہِ جہاں میں یہ صدیوں سے ہے سلسلہ

میں بھی اِک آبگینے کے مانند جیسے بکھرنے کو تیار ہوں
آبگینہ ہو یا
کوئی کوزہ ہو
یا کوئی جام ہو
سب کی قسمت میں جب ہے بکھرنا تو پھر
کب تلک ہم بچاتے رہیں گے اسے
عشق کی یہ سلگتی ہوئی راکھ اب سرد ہونے کو ہے

مجھ کو ہونے کی نہ ہونے کی خلش ہے کیسی

دل کی دیوار پہ تصویر لگی ہے کب سے
وقت نے جس کے خد وخال مٹائے بھی نہیں
ہیں فصیلِ لب وگفتار پہ کچھ لفظ کھڑے
جو کہ آواز میں ڈھلنے کو ہیں راضی کب سے
سازِ خاموش میں نغمے بھی مچلتے ہیں بہت
خلوتِ ذات میں چپ چاپ میں سنتی ہوں جنھیں
کتنے ہی کارِ جہاں راستہ روکے ہیں مرا
اب میں تھک ہار کے رستے کو نہ منزل کر لوں

تیری تصویر، مرے لفظ، وفا کے نغمے

وقت کی گرد سے محفوظ ہیں اب تک لیکن
جانے وہ کون سا لمحہ ہو کہ پھر کچھ نہ بچے
وقت پیمانۂ حادث سے میں ناپوں کیسے؟
کتنے اسرار ہیں پوشیدہ مرے ہونے میں
میں ہوں موجود، عدم بھی تو ہے موجود مگر
اور اگر ہوں تو کہاں تک ہوں یہ معلوم نہیں
اور نہیں ہوں تو یہ ہونے کی خلش ہے کیسی

تیری تصویر، مرے لفظ، وفا کے نغمے
کیا عدم کے یہ اندھیرے میں اتر جائیں گے
ایک موجود سے معدوم تلک کا وقفہ
وقت کا کھیل ہے لمحوں کی یہ سب بازی گری
مجھ کو ہونے کی نہ ہونے کی خلش ہے کیسی؟

عالمِ عجلت

آئینہ خانۂ عالم مجھے معلوم ہے یہ
موجۂ وقت پہ جو عکس ابھرتے ہیں یہاں
اُن کی قسمت میں فنا لکھی ہے
نہ تو امروز ہے کچھ اور نہ ہی فردا ہے
ایک دیروز کا لمحہ ہے یہ ہستی اپنی
سیکڑوں عکس ابھرتے ہیں بکھرنے کے لیے!

آئینہ خانے کی ویرانی کا عالم یہ ہے
ایک بھی عکس کو محفوظ نہیں رہنا ہے
عکس در عکس عجب عالمِ عجلت ہے یہاں

روز تصویر بدل جاتی ہے مے خانے میں
ساغرِ ہست اٹھانے بھی نہیں پاتے ابھی
ساقیِ نیست ہمیں جامِ فنا دیتا ہے

ہے عجب عالمِ عجلت کہ یہاں ہر لمحہ
دوسرے لمحے کو کھا جاتا ہے قاتل بن کر
آب و گِل گوندھ کے کوزے جو بنائے گئے ہیں
ان کی تخلیق کا حاصل ہی بکھرنا ٹھہرا
کوزہ گر کیا تجھے تکلیف نہیں ہوتی جب
تیرا فن خاک میں مل جاتا ہے

نور کا بوسہ

مرے ندیم!
میں حیران سوچتی تھی یہی
کہ یہ بدلتی ہوئی رُت
یہ سرد سرد ہوا
تمھارا ساتھ نہ ہوتا تو کیسے چلتی بھلا!
نظر طلسمِ تمنا سے جگمگاتی ہوئی
ہمارے ہاتھ تھے اک دوسرے کے ہاتھوں میں
بہت سے وعدے
محبت کے سیکڑوں قصّے
سنا رہے تھے ہم اک دوسرے کو چلتے میں

کہیں کہیں پہ زمانہ بھی راہ میں حائل
ہمارے خلوتِ خانہ میں سر اٹھائے ہوئے
مگر ہمیں تو بس اک دوسرے سے مطلب تھا
ہوا کی نرم روی بھی تو بوجھ لگتی تھی

وہ صبح نور کا بوسہ تری نگاہوں سے
بہت سے خواب تھے بستر کی سلوٹوں میں چھپے
جنھیں بتانے سے زیادہ چھپانا پڑ گیا تھا

ہم اپنی ذات کے خلوت کدے میں محوِ سفر
تھا صبح و شام یہی کام ہو نظر پہ نظر
پھر ایسا لمحہ بھی آیا
کہ وقت کے ہاتھوں
کلک کیا جو بٹن
اسکرین غائب تھی

جلے بجھے سے ستاروں کی طرح حرف ابھرے
نہ اب وہ ہاتھ، نہ وعدے، نہ نور کے بوسے
لکھا تھا اتنا کہ نیٹ ورک منقطع ہوا ہے

وقت کا شیلف

کتنی دل کش کتاب لگتی ہے
سرورق تو بہت ہی دیدہ زیب
ایک اِک حرف کتنا جاذب ہے
ہر ورق اس طرح مہکتا ہے
جیسے کورا بدن ہو ناری کا
سوکھی مٹی پہ جیسے پانی پڑے
سوندھی خوشبو مشامِ جاں کو چھوئے

شیلف میں یہ پڑی کتاب کہے
میں سسکتی ہوں کوئی پڑھتا نہیں
یہ مہک باسی ہونے والی ہے
جانے کتنی کتابیں ایسی ہیں
اپنے قاری کی منتظر ہی رہیں
وقت کے شیلف سے نکل نہ سکیں

گریۂ تحیّر

بڑا ہی پیارا لگے ہے یہ طفلِ گریہ کناں
کسی کھلونے کے چھننے پہ رو رہا ہے بہت
ستارہ آنکھوں میں موتی چمک رہے ہیں بہت
ہے اپنے کارگرِ ہستی میں محوِ مادرِ او
ملے جو مہلتِ مصروفیت تو دیکھے اسے
ابھی وہ آئے گی اور بے قرار ہو کے اسے
اٹھا کے بانہوں کے حلقے میں پیار کرلے گی
پھر اپنے ملگجی آنچل میں اس کے آنسوؤں کو
وہ جیسے سلمہ ستارے کی طرح ٹانکے گی

ہیں میری آنکھوں میں کب سے ستارے رقص کناں
بڑی امید سے میں آسمان تکتی رہی
وہ اپنے کارِ جہاں میں لگا ہوا ہے مگر
اگر وہ آ نہیں سکتا تو اتنا ہی کردے
مری طلب کو وہیں سے وہ بے طلب کردے
مرے سوال کی طاقت کو چھین لے مجھ سے
میں تھک چکی ہوں تحیّر کی آہ و زاری سے

سفرِ رائیگاں

میں لڑکھڑا رہی ہوں آج کل بہت خود میں
کسی کا دستِ طلب اور میرا حرفِ دعا
قدم قدم پہ مرے راستے میں حائل ہیں
مگر میں کون سے رستے کی بات کر رہی ہوں
زمانہ ہو گیا خود سے قدم نکالے ہوئے

یہ اپنی ذات سے ہی ذات کا سفر آخر
کبھی تو ختم ہو کنجِ وجود میں آ کر
میں تھک گئی ہوں بس آرام کرنا چاہتی ہوں
بدن کی بند گلی سے نکلنا چاہتی ہوں

کلینکل ڈیتھ ہو چکی ہے!

سو آپ! اس لاش کو اب اٹھا کے لے جائیں
اسے کسی وصال آکسیجن کی اب ضرورت نہیں رہی ہے
نکال دیجیے تمنا کا وینٹی لیٹر
کسی بھی شوق کی ڈرپ سے
اُسے توانائی اب نہیں مل سکے گی

ذرا سی ہمت دکھائے یہ بے ہمتی تو
روح آزاد ہونا چاہتی ہے
بہت دنوں سے یہ پرواز چاہتی ہے
تمام عارضی سہاروں کو ترک کر کے

اسے اب آزاد کر ہی دیجیے
تمام وائٹلز بتا رہے ہیں
کلینکل ڈیتھ ہو چکی ہے!

سعی

ایک صحرائے زندگی ہے جہاں
تشنہ لب لوگ چلتے رہتے ہیں
پیاس بڑھتی ہے تو جدھر دیکھو
ہر قدم پر سراب ملتے ہیں
ہاں مگر ایسا بھی ہوا ہے یہاں
جب طلب اور کوششِ پیہم
ایڑیاں رگڑے حُسن کے آگے
سینۂ دشت، قلبِ سنگ سے بھی
چشمۂ عشق پھوٹ پڑتا ہے
تم بھی اسماعیلِ طلب کو ذرا

حسن کو سونپ کر سعی تو کرو
اس بے آب و گیاہ صحرا میں
کتنے چشمے اُبلنا چاہتے ہیں

ادھوری تصویر

اے مصور مری تصویر پڑی ہے کب سے
اب کسی طور ذرا اس کو مکمل کر دے
اپنی تخلیق میں وہ رنگ بھی شامل کر دے
جو ترے ذوقِ ہنر کی بھی گواہی ٹھہریں
جھیل سی آنکھوں کی گہرائی میں تو ڈوب گیا
سرخ ڈورے جو ہیں حیرت کے نہ دیکھے تو نے
لب کے پیمانے تری پیاس بجھاتے ہیں مگر
تشنہ پیمانوں کو تو جرأتِ اظہار بھی دے

میری تصویر دھنک رنگ نہیں ہو پائی
میرے خوابوں کو تری آنکھ نہیں دیکھ سکی
تو ہے خطّاط مرے حرفِ بدن کے بدلے

وہ لکیریں بھی بنا فکر کو ظاہر جو کریں
گیسو و عارض و لب ہی ترا معیار رہے
سنگِ مرمر کا بدن ہی ترا شہکار رہے
میں کچھ اس سے بھی سوا ہوں تجھے معلوم نہیں
میں تری دوست ہوں لیکن تری محکوم نہیں

ایک نظم صرف تمھارے لیے

مجھ میں آتش جو چھپی ہے اُسے بھڑکانے میں
وصل سے زیادہ ترے ہجر کی خواہش ہے مجھے
جسم اور جان سے آگے بھی کوئی دنیا ہے
اور ان راہوں میں تنہا ہی بھٹکنا ہے مجھے
تجھ کو تسخیرِ بدن کی ہی رہی ہے خواہش
اور میں روح کے سودے کے لیے سوچتی ہوں
تجھ کو معلوم ہے؟ جو شے بھی میسّر آ جائے
اُس کی پھر قدر کہاں رہتی ہے
میں تجھے سونپ دوں خود کو تو خسارہ ہے بہت
ڈوبنے کے لیے آنکھوں کا کنارہ ہے بہت

کیا یہ ممکن ہے کہ تُو رنگ میں بھی رنگ لے اپنے
اور دامن پہ مرے داغ بھی کوئی نہ لگے
وصل کے بعد تو حیرت میں کمی آتی ہے
پھر جنوں خیزی کی شدت میں کمی آتی ہے
حیرتِ عشق کی گم نام مسافر ہوں مجھے
ایسا روکر مری حیرت میں اضافہ ہو جائے
اور اس عشق کی شدت میں اضافہ ہو جائے

عوام

مرے چہرے پہ جو آنکھیں ہیں
وہ میری نہیں ہیں
ان آنکھوں سے وہی کچھ دیکھنا ہے
دوسرا جو کچھ دکھائے گا
بہت رنگین منظر ہے !
مگر افسوس ہے اس کا
کہ پس منظر میں جو کچھ ہے
وہاں تک اب مری نظریں نہیں جاتیں

یہاں پتلی تماشا ہو رہا ہے

تماشا دیکھنے والوں کو
اتنا حق نہیں وہ پوچھ بیٹھیں
ڈور کس کے ہاتھ میں ہے
ناچنے والوں کو کتنا ناچنا ہے
کب اشارے پر قدم کو روکنا ہے
تماشا پیش کرنا ہے
اور کہاں پر ٹھہر جانا ہے
یکایک بس یہاں
اک مختصر وقفہ ہی ہوتا ہے
کہ جب اس ڈور کو اک ہاتھ سے
پھر دوسرے ہاتھوں میں جانا ہے
یہاں پتلی تماشا ہو رہا ہے
اس تماشے کے سب ہی کردار بے بس ہیں

تہذیبِ نفس

قیدِ تنہائی میں آزاد طبیعت میری
فکر کے پھول کھلا دیتی ہے ویرانے میں
اور جب شام کو گلشن سے صبا آتی ہے
سیکڑوں رنگ بھرا کرتی ہے افسانے میں
چاندنی رات میں کرنوں کا سہارا لے کر
افقِ دل پہ چراغاں کا سماں ہوتا ہے
مجمعِ طفلاں میں یہ نور کہاں ہوتا ہے

ایسی تنہائی پہ صدقے ہو تری بزمِ طرب
جس میں ہوں فکر کے زنداں میں مقیّد سوچیں

چند بے کار سی باتوں پہ ہو محفل سرگرم
چند بے سود تمناؤں کی جانب ہوں قدم

فکر سے لفظ کی نسبت کو کوئی کیا سمجھے
میری تنہائی کی قیمت کو کوئی کیا سمجھے
اس سے تو نفس کو تہذیب عطا ہوتی ہے
رخشِ امید پہ مہمیز لگا کرتی ہے

Mercy Killing

زندگی! تجھ سے تعلق کو نبھاتے ہوئے لوگ
قطرہ در قطرہ پئیں زہر یہ جینے کے لیے
زخم جب دیتا ہے تو درد بہت پہنچتا ہے
چارہ گر درد کے بڑھنے کی دوا چاہیے ہے

مجھ میں اب سارے ہی آثارِ نمو ختم ہوئے
ایک امید کا بجھتا سا دیا ہے جس میں
وقت کچھ تیل تمناؤں کا ٹپکاتا ہے
بے سبب نبض مراسم کی چلے جاتی ہے
بے وجہ دل یہ دھڑکتا ہی چلا جاتا ہے

عالمِ سکتہ میں ہیں خواب پریشاں سارے
کیفیت نزع کی ہے آرزوئے چشمِ وصال
زخمِ فرقت بڑا کاری ہے مسیحا میرے
یاسیہ ہجر زدہ زیست نہیں چاہیے ہے
مژدۂ موت کا اب دل کو یقیں چاہیے ہے

الٹی بستی

تیری بستی کے قرینے ہیں عجب
کوئی شے اپنی جگہ پر نہیں ہے
یہاں ہر چیز ہوئی ہے تلپٹ
زلزلے برپا ہیں معیاروں میں

گونگوں کو شعلہ بیانی کی سند
بہروں کو حسنِ سماعت پر داد
اندھوں کی دیدہ وری کی تعریف
اور دانش کہ جنھیں چھو کے بھی گزری نہ کبھی
ان کی دانائی کے چرچے ہیں بہت!

پستہ قد اور یہ پُرعیب ہجوم
اپنی کوتاہی پہ نازاں ہی رہا
اور دو چار ہنرمند جو ابھرے بھی کبھی
منہ چھپائے ہوئے پھرتے رہے شرمندہ سے
اپنی بے قدری پہ سمجھاتے رہے ہیں خود کو
بھلا مقدار سے معیار کبھی بدلا ہے
''دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے''

من کہ جویای خودی از بے خودی

میرے آثار کسی لوک کہانی میں تمھیں
کہیں مدفون ملیں گے اک دن
میرے کردار میں محفوظ تھی تہذیب مری
وہی تہذیب کہ جس میں مرا کردار فقط
ایک خاموش تماشائی کا لکھا گیا تھا

کسی آثارِ قدیمہ کی عبارت کی طرح
میں ہمیشہ رہی تشریح طلب دنیا میں
کوئی بھی واقفِ حالات نہیں ہو پایا
دل مرا داغِ شناسائی نہیں دھو پایا

کبھی آثارِ قدیمہ کو اگر دیکھنا تو
حدّتِ شوق لیے جو کہ رگوں میں تھا رواں
کسی پتھر پہ وہی خون نظر آئے گا
چوم کر تم اُسی پتھر کو اٹھا کر رکھنا
تا کہ حرمت پہ کوئی حرف نہ آنے پائے

دسمبر

طاقِ دل پر تری یادوں کو سجا رکھا ہے
اس تبرّک کی ضرورت مجھے جب پڑتی ہے
اپنی آنکھوں سے لگاتی ہوں انھیں چومتی ہوں
اور پھر طاق پہ دوبارہ سجا دیتی ہوں
عہدِ فرقت میں شب و روز گزر جاتے ہیں

تیری یادیں ہیں کبھی پھول کی صورت دل میں
اور کبھی موتیوں کی طرح سے آنسو بن کر
چشمِ احساس سے دامن پہ بکھر جاتی ہیں
میں انھیں سینت کے رکھتی ہوں گزارے کے لیے

تیری یادوں کو مگر سینت کے کب تک رکھوں
برف لمحوں میں یہ ہاتھوں سے پھسل جاتی ہیں

اُس سے کہنا کہ دسمبر بھی چلا آیا ہے
سرد موسم مرے احساس کو گرماتا ہے
دلِ وحشی تو دھڑکتا ہی چلا جاتا ہے
رک نہ جائے کہیں تجدیدِ تمنا کی گھڑی
مخملیں شوق کی چادر ہے مرے سر پہ پڑی
اس سے کہنا کہ دسمبر نہ گزر جائے کہیں
اور تقویمِ محبت نہ بکھر جائے کہیں

میں نائیں سب تو

ابھی طفلِ مکتبِ عشق تھی
کہ سبق مجھے یہ دیا گیا
ترے پاس جو بھی ہے وار دے
تجھے زندگی کی تلاش ہے؟
تو پھر اپنے آپ کو مار دے

مرا عشق سے یہ سوال تھا
مرے پاس کیا ہے جو وار دوں؟
جو بدن پہ سر ہے اتار دوں؟
یہ تو مکتبِ عشق کا فیض ہے

مجھے کچھ بھی یاد نہیں رہا
بجز ایک بات کہ تو ہی تو
بجز ایک ذات کہ تو ہی تو

فون نمبر (۰۵۰۶۱۴۰۹۶۸)

یہ کن نمبروں کی طرف میری انگلیاں
آج بڑھنے لگیں
یہ کیا بات ہے
کون سا رمز ان نمبروں نے چھپا رکھا ہے

ادھر انگلیوں نے بٹن جو دبایا
تو پھر دل کے تاروں سے کتنی مدھر گھنٹیاں بج اٹھیں
ایک آواز ابھری جو مخمور تھی
نام لے کے یہ پوچھا کہ کیسی ہو تم ؟
اور پھر اُس گھڑی

مجھ کو اپنا ہی نام اچھا لگنے لگا

بہت دن ہوئے
اس شناسا سے نمبر کو ڈائل کیے
نمبروں کی یہ دنیا بھی کتنی پُر اسرار ہے
زندگی کی یہ ڈائرکٹری نے کہا
تیرے حصے کے جتنے بھی نمبر تھے سب
وقت نے محو ہی کر دیے
اس لیے پُر تمنا یہ نمبر دبانے کی کوئی ضرورت نہیں
ارے بے خبر! خوش گماں! زندگی میں تو گہرا خلا ہو گیا
اور خلا میں کوئی بھی صدا
اب سماعت کو حاصل نہ کر پائے گی
تیری آواز حُسنِ سماعت سے محروم ہے
نمبروں کی یہ دنیا بھی کتنی پُر اسرار ہے

بین الاقوامی منظر نامہ

کھلاڑی رو بہ رو بیٹھے ہیں
اپنی چال چلتے ہیں
بچھائی ہے سیاست کی بساط اور اُس پہ لاشیں ہیں
کہیں مقتول شیخانِ حرم کے
کہیں پر شاہ کے کُشتے
کہیں ملکہ کے مُردے ہیں
کہیں جمہوریت کے ادھ موئے زخمی کراہے جا رہے ہیں
کھلاڑی تعزیت کے رنگ کو چہرے پہ ملتے ہیں
بڑی تہذیب اور شفقت سے لاشوں کو اٹھاتے ہیں

انھیں معلوم ہے یہ اپنے مہرے کب بدلتے ہیں
پیادوں کو کہاں پر گردنیں اپنی کٹانی ہیں
کہاں پر کس طرح اک دوسرے کو مات دینی ہے

بہت عرصے سے سارے میچ ہی اب فکس ہوتے ہیں

نقشِ قدم

جہاں سے گزرے تھے ہم تم
سنا یہی ہے وہاں
زمیں پہ سبزہ اُگا ہے
فضا معطّر ہے
بچھی تھی ریت جو ساحل پہ اس کے ذرّوں میں
ہمارے نقشِ قدم اب بھی جگمگاتے ہیں
سنا ہے لوگ ہمیں یاد کر کے روتے ہیں
مسافرانِ محبت سے اتنا کہنا ہے
کہ قافلے جو گزرتے ہیں وہ پلٹتے نہیں
محبتوں کے سفر میں یہی خیال رہے
جہاں سے گزرو مثالِ صبا گزر جاؤ
حیاتِ عشق میں مرنا پڑے تو مر جاؤ

مکر و ریا کے سِکّے

خدا فروشی کی اس تجارت میں
آ ج کل ہے بڑی رعایت
قیمتیں گر گئی ہیں !!
چلو تو مکر و ریا کے سکّوں سے اپنے گھر ہم خدا کو لائیں
کسی بلند طاقِ رسم پر سجائیں
پھر اس تاجرانہ معاشرے سے
خدا پرست ہونے کی سند تو مل سکے گی
ذرا سا حلیہ بدل کے دیکھو
خدا سے نزدیک ہونے کی سب گواہی دیں گے
خدا فروشی کی اس تجارت میں
آ ج کل ہے بڑی رعایت
خدا کی اور زہد کی قیمتیں گر گئی ہیں

’’میں نے تجھے پہچانا ارادوں کے ٹوٹنے
اور نیّتوں کے بدل جانے سے‘‘

میں اپنے لہجے کو آواز کو ترس گئی ہوں
نئی زبان کے کچھ لفظ ہیں لبوں پہ مرے
میں آگ لانے کا اکثر ارادہ کرتی رہی
زبان جل گئی مجھ کو پیمبری نہ ملی

اور اب یہ حال ہے یکسر بدل گئی ہوں میں
ہے اتنی تیز یہ بادِ شمال دھڑکن کی
کہ جسم ریت کی صورت بکھرنے والا ہے

ہر ایک پتا تمنا کا جھڑ گیا دل سے
ہر ایک شاخِ معانی سے ربط ٹوٹ گیا
تمام بول محبت کے گنگ ہو چکے ہیں
میں رائیگانی پر اپنی بہت فسردہ ہوں

ہے ارد گرد مرے راکھ کچھ ارادوں کی
بدلتی نیتیں آمادۂ سوال ہوئیں
اب اپنے رب کی میں پہچان پانے والی ہوں؟
(حضرت علی علیہ السلام کا قول)

کچا رنگ

سبز، زرد، سرخ اور بنفشی
چمن کے سارے رنگ پُرکشش ہیں
مگر میں ڈر رہی ہوں کہ کوئی رنگ اڑ کے
مرے دوپٹے کے ژولیدہ رنگوں پہ چڑھ نہ جائے
تمنائے دل کے کینوس پر
مجھے تماشائے فنِ تجرید سے دور رکھنا
میں اپنا بیراگی رنگ اوڑھے
چمن کو بس دور سے تک رہی ہوں
مجھے تمھارے رنگوں سے کیا لینا دینا
میں کچے رنگوں عارضی موسموں سے دور بھاگتی ہوں

فشارِ آگہی

مجھے سونا ہے لیکن
روشنی سینے کے اندر جل رہی ہے
جو مجھے سونے نہیں دیتی
تلاشِ رائیگاں میں التجا کرتی ہوئی دھڑکن
ندامت کی گھڑی کی سوئیوں سے گونجتی ٹک ٹک کی آوازیں
میں سونا چاہتی ہوں
اور گھڑی کی سوئیاں سونے نہیں دیتیں

سراپا داخلیت اور درونِ ذات میں اک دھند چھائی ہے
کوئی واضح عبارت اب تلک میں پڑھ نہیں پائی

عجب ہی بے یقینی کی لکیریں
مطلعِ افکار پر اکثر ابھرتی ہیں
کہ جن کو پڑھنے کی کوشش میں لکنت آ گئی میری بصارت میں
مجھے سونا ہے اور لکنت زدہ لہجہ مجھے سونے نہیں دیتا

کوئی گُل کر دے آ کر روشنی
اور مطلعِ افکار سے ساری لکیروں کو مٹا دے
عذابِ خودشناسی سے کوئی آ کر بچا لے
مجھے وجدان کی اس قید سے آ کر چھڑا لے
کہ میں بھی بے خودی سے بے نیازانہ گزر جاؤں!!

بکاؤ مال

عجب بازارِ عالم ہے
جہاں یہ ہوتا رہتا ہے
کہ اپنے خواب جب ہم دیکھنا چاہیں
تو پھر مستعار آنکھیں
دوسروں سے لینا پڑتی ہیں
عجب سمجھوتا ہے دل کا
کہ جس پر ہر گھڑی پچھتاوا ہوتا ہے
مگر تعبیر کی صورت

تو اس سے بھی زیادہ پُر اذیت ہے

ہم اپنے خواب کی تعبیر کی خاطر
کبھی بے چہرگی کا کرب سہتے
کبھی سودا دماغ و دل کا ہم کو کرنا پڑتا ہے
ہمارے خواب بھی بکتے ہیں
تعبیریں بھی بکتی ہیں
بکاؤ مال ہیں ایسے
کہ قیمت بھی نہیں ملتی

حرکتِ معکوس

نظامِ سرمایہ داری کام اپنا دکھا چکا ہے
ہر طرف آگ لگ چکی ہے
تجارتِ غم پنپ رہی ہے
دکھوں کا کاروبار بڑھ گیا ہے

گلوبل ولیج کی آزاد مارکیٹ میں
حصولِ انصاف عنقا ہو چکا ہے
آزادیٔ رائے کے نام پر پیچیدہ افکار بِک رہے ہیں
کہیں پہ سائنس فتح کے نعرے لگا رہی ہے
کہیں پہ انسانیت اپنا چہرہ چھپا رہی ہے

عجیب جنگی جنوں کا دنیا کو سامنا ہے
فنِ تشہیر نے مصنوعاتِ ناقص کو بھی
کاملیت کا درجہ عطا کیا ہے
یہ دورِ ارتقا تو حرکتِ معکوس بن چکا ہے!!

رقصِ فسوں

میں جو مشرق کے شبستانوں میں مصلوب ہوئی
میں جو میخانۂ مغرب سے بھی منسوب ہوئی

پہلے تقدیس کے ناموں پر مرا سودا ہوا
اپنی حرمت کا میں تاوان ادا کرتی رہی
اب بھی بازارِ تصرف میں بہت سستی ہوں
اب بھی بکتی ہوں تو قیمت بھی مجھے ملتی نہیں

میں وہ بازارِ ضرورت کی ہوں جنسِ مطلوب
حبسِ بے جا میں جسے رکھتا ہے اس کا محبوب

جسم ہی جسم بنائی گئی تصویر مری
خواب در خواب ہی لکھی گئی تعبیر مری
حلقہ در حلقہ بدلتی رہی زنجیر مری
اک خرابے میں ہی ہوتی رہی تعمیر مری

دائرہ وار مرا رقصِ فسوں جاری ہے
ردِّ تشکیل و تمنائے حزیں طاری ہے

ارتکاز

انتساب

ڈاکٹر ثروت زہرا ، انیق احمد اور جبران ناصر
کی دوستی کے نام

اپنے دامن سے کانٹے تمنا کے جھاڑے اور اپنے میں گوشہ نشیں ہو گئے
آسمانِ محبت تجھے کیا خبر جُھکتے جُھکتے تری ہم زمیں ہو گئے

اپنی آنکھوں کی حیرت نہیں چُھپ سکی سُرخ ڈوروں سے بے خوابی ظاہر ہوئی
کس طرح سے چھپاتے زمانے سے ہم خواب تو موجۂ عنبریں ہو گئے

ڈوبنے اور ابھرنے کے اس کھیل میں خود شناسی کے کتنے جزیرے پڑے
کیا بتائیں تمھیں اور پھر ایک شب خود سے بچھڑے خدا کے قریں ہو گئے

وقت بالوں میں چاندی بچھاتا گیا، ہجر آنکھوں کا کاجل بہا لے گیا
آ کے مشاطہ دیکھے تو حیران ہو ہم تو پہلے سے بڑھ کر حسیں ہو گئے

خاک میں پوری بستی مِلا دی گئی دل میں دیوارِ گریہ اُٹھا دی گئی
ڈھونڈتے ڈھونڈتے مرہمِ زخمِ دل داغ سینے میں پھر جاگزیں ہو گئے

مکر لالچ، سیاست، جفا ، پر جفا اور کذب و ریا
ہم تو شیطان کو کہہ رہے ہیں بُرا، کس لیے آپ چیں بہ جبیں ہو گئے

(نذرِغزہ وفلسطین)

سارے ہی زخم بے رفو ، سارا بدن لہو لہو
شعلہ بہ شعلہ آشیاں ، تیغ بہ تیغ ہر گلُو

ایسی خزاں ہے الاماں ، ایسی ہوا ہے الحفیظ
ساری دعائیں رائیگاں، سارے شجر ہیں بے نمو

ایک قطار ہے لگی ، عجلت میں ہے قضا کھڑی
کس کو خبر ہے کون ہو، مقتلِ جاں میں سُرخرو

آپ خدائے اقتصاد ، اور غلامِ بد نہاد
بھوک مٹانے آئے ہیں ، کاسہ بدست روبرو

بادِ سموم گلشنِ ہستی کو روندتی گئی
غنچے مسل دیئے گئے وحشت زدہ ہیں رنگ و بو

ایک صدائے بیکراں، خاک ہوا ہے خاکداں
خاک تلاش کرنی ہے ، خاک ہے ساری جستجو

آئینہ خانہ بن گیا ہے گھر کا گھر تمام
حیرت زدہ سے ہو گئے دیوار و در تمام

دنیا ترے فریب میں ہرگز نہ آئیں گے
لے جا ہمارے پاس سے یہ مال و زر تمام

بے حوصلہ چراغ کہاں تک جلائیں ہم
کس شام جانے ہو گا ہمارا سفر تمام

برگِ اُمید ٹوٹ کے ہر سُو بکھر گئے
فصلِ خزاں میں سوکھ گیا ہے شجر تمام

دیدہ ورانِ شوق نے قیمت لگائی جب
ہم نے بھی رِگروی رکھ دیئے اپنے ہنر تمام

اتنی بھی بدلحاظی نہ کر اے نشاطِ عشق
آدابِ میکشی میں ہے حُسنِ نظر تمام

زنجیر توڑنے کا نہ آیا کبھی خیال
وحشت میں اپنے کاٹ دیئے بال و پر تمام

❁

خلوصِ دیدۂ پُرنم تلاشتے رہیں گے
ہم اپنے زخم کا مرہم تلاشتے رہیں گے

ہماری آنکھوں میں گریہ کا نور ہو جس سے
خیامِ فکر میں وہ غم تلاشتے رہیں گے

ہے اضطرابِ معانی میں لفظ لفظ رچا
جو کھو گیا وہی عالم تلاشتے رہیں گے

تعلقات کی بے رنگ تتلیوں کے لیے
کشیدہ کاری کو ریشم تلاشتے رہیں گے

سفر میں تشنگیِ ذات کے وسیلے سے
خود آگہی تجھے ہر دم تلاشتے رہیں گے

عدم کی راہ سے آگے وجود سے بھی پرے
اضافیت تجھے پیہم تلاشتے رہیں گے

فضا میں گونج رہی ہیں بہت سی آوازیں
نوائے تارِ دو عالم تلاشتے رہیں گے

اِن ہی بُتانِ زر و مال کو ہٹاتے ہوئے
خدا کی آیتِ محکم تلاشتے رہیں گے

براہِ دشتِ خرد دل کہیں بھٹکتا ہے
گُماں کے شہر سے آگے یقیں بھٹکتا ہے

جہانِ خاک پہ دَم ہو رہا تھا کُن فیکوں
شبِ الست کا وعدہ وہیں بھٹکتا ہے

زمانہ واقفِ خُوئے گریز ہے پھر بھی
کبھی کبھی دلِ گوشہ نشیں بھٹکتا ہے

ہمارے سر پہ رہا عشق زاد کا سایہ
دل و دماغ مسلسل یہیں بھٹکتا ہے

ادب کی راہ میں منزل کبھی نہیں آتی
تمام عمر سخنور کہیں بھٹکتا ہے

کبھی جو بابِ تحیّر میں کوئی داخل ہو
تو رقص کرتے ہوئے اوّلیں بھٹکتا ہے

سازِ دل، نغمۂ جاں، شور و فغاں ختم ہوا
لَو بھڑکنے لگی پھر اس کا دھواں ختم ہوا

وقت کی دھوپ نے ہر جسم کو جھلسا ڈالا
شام آئی تو ہر اِک سایۂ جاں ختم ہوا

چارہ گر، وسعتِ تسلیم و رضا کی خاطر
ختم بیمار ہوا، درد کہاں ختم ہوا

ایک پندارِ محبت کا ، بھرم ٹوٹنے سے
چلو اچھا ہی ہوا وہم و گماں ختم ہوا

سوکھے پتّوں نے کیا رقص بہت دیر تلک
جب ہواؤں نے کہا دورِ خزاں ختم ہوا

شعلۂ عشق نے جب راکھ ہمیں کر ڈالا
تب کہیں جا کے غمِ سوزِ نہاں ختم ہوا

اِک سفر میں تھے سبھی ساتھ مگر اس کے بعد
کون، کب، کیسے مری جان کہاں ختم ہوا

لفظ جب عشق کی تمثیل میں تحریر ہوئے
کوئی سوؔدا کوئی غالبؔ تو کوئی میرؔ ہوئے

رفتگاں لمحۂ موجود میں در آئے تھے
اُن کی تصویر کے ہم سامنے تصویر ہوئے

آگہی روز تماشائے خودی کرتی رہی
کتنے عالم تری تمثال میں تسخیر ہوئے

خود ہی رفتارِ جنوں تیز نہیں ہونے دی
ہم بھی کیا لوگ تھے جو اپنی ہی زنجیر ہوئے

خانہ زادِ لب و رخسار کہاں سمجھیں گے
سادہ دل کیسے یہاں لائقِ تعزیر ہوئے

سلسلہ ٹوٹے بھی تو کس طرح ٹوٹے آخر
خواب ہی خواب جہاں خواب کی تعبیر ہوئے

زندگی تجھ کو ہے معلوم، کہاں رہتے تھے
ایک بستی تھی جہاں دل زدگاں رہتے تھے

اب جہاں خاک اڑا کرتی ہے ارزانی کی
خالی آنکھوں میں وہاں خوابِ گراں رہتے تھے

باعثِ تنگِ تمنا دلِ صد چاک ترے
کچھ رفو گر یہاں پیراہنِ جاں رہتے تھے

جلوۂ شاہد و مشہود کا یہ معجزہ تھا
جتنے پنہاں تھے وہ اتنے ہی عیاں رہتے تھے

تم الگ وضع کے ہم اور طرح کے لیکن
شِیر وشکر کی طرح قالبِ جاں رہتے تھے

اضطرابِ غمِ تنہائی سے بچنے کے لیے
ہم وہاں رہتے نہیں تھے کہ جہاں رہتے تھے

ہم ترے شہر میں ہر اِک سے یہی پوچھتے ہیں
کوئی بتلائے کہاں کج کلہاں رہتے تھے

دل کے پیمانے میں جو غرق کرے دنیا کو
وہ کرامات لیے پیرِ مُغاں رہتے تھے

اکیلے پن کی اذیت چھپائی جا رہی ہے
شبِ فراق غزل گنگناتی جا رہی ہے

اُس ایک سنگِ گراں کا تمھیں بتائیں کیا
جِسے تراش کے صورت بنائی جا رہی ہے

بدن کا روح سے کل شب مکالمہ یہ رہا
ترے خرابے کی تعمیر ڈھائی جا رہی ہے

گمانِ عشق سلامت رہے کہ تیرے سبب
یہاں یقین کی دولت گنوائی جا رہی ہے

سفید پوشیِ دادِ طلب سلامت باش
سخن کے شہر میں عزت بچائی جا رہی ہے

مآلِ عمرِ گزشتہ کے آئینے میں سبھی
ہمیں ہماری ہی صورت دکھائی جا رہی ہے

شکوہِ جنسِ گزشتہ کے قدردان سُنیں
دُکانِ گُنجِ تمنا بڑھائی جا رہی ہے

قبائے رنگِ معانی سخن کی دنیا میں
خیالِ یار کی خوشبو لٹائی جا رہی ہے

ایک ایک لفظ سے زنجیر کی جھنکار اُٹھے
جیسے زندانِ معانی سے گرفتار اُٹھے

بند دروازہ ہو یا راہ میں دیوار اُٹھے
وہ جب آواز دے سویا ہوا بیمار اُٹھے

خیمہِ عشق سے آوازِ اذاں گونجی جب
سب ہی بیٹھے رہے ہم ایسے گناہ گار اُٹھے

لمحہِ عصر نے سر کر لیا نیزے کا سفر
حشر سے پہلے یہاں حشر کے آثار اُٹھے

مقتلِ زیست سے اندیشے یہی پوچھا کیے
جانے کب تیر کھنچے کس گھڑی تلوار اُٹھے

لوگ آواز اُٹھانے پہ اُٹھائے گئے ہیں
اور حاکم کا یہ فرمان ہے غدّار اُٹھے

نیند ایسی تھی سرِ دشتِ ہدایت طاری
راہبر اُٹھے نہ سوئے ہوئے رہوار اُٹھے

تیری باتوں نے معطّر کیا تنہائی کو
تیری یادوں سے مہک یارِ طرح دار اُٹھے

بقدرِ صورتِ حالات راستہ نکلے
نیاز مند تری رہگزر پہ جا نکلے

تمھارے حُسنِ تغافل کی داد دینے کو
ہم ارتکازِ تمنا سے بارہا نکلے

شکستِ عہدِ تمنا کی کیا شکایت ہو
ہمارے خواب ہی ہم سے گریز پا نکلے

ہماری چشمِ تحیّر سے پوچھ کر دیکھو
غزال دشت سے کس کی گلی میں جا نکلے

کسی کے دستِ بریدہ کو یاد کرتے ہوئے
عَلَم سیاہ زمانے میں جا بجا نکلے

فروغِ نازِ جنوں روک لے قدم میرے
خود آگہی کے تماشے سے جانے کیا نکلے

حریمِ عشق کی معجز نمائیوں کی قسم
خدا کے گھر سے جو نکلے تو پارسا نکلے

نبود و بود تمنائے لامکاں کے سوا
یقین بھی ساتھ ہے اُمیدِ رائیگاں کے سوا

فریبِ ہست و نمودِ غبارِ جاں کے سوا
کہیں کہیں اُسے دیکھا یہاں وہاں کے سوا

ہر ایک راستہ دل سے وہیں نکلتا ہے
نکل کے جائیں کہاں شہرِ بے اماں کے سوا

پڑی جو پاؤں میں زنجیر تو ہوا معلوم
بلائیں اور بھی ہیں مرگِ ناگہاں کے سوا

مجھے بکھیرنے والی ہوا سے یہ کہہ دو
رکھا ہی کیا ہے یہاں میرے خاکداں کے سوا

تعلقات کا ریشم الجھتا جاتا ہے
میں چھوڑ دوں گی یہ دنیا فلاں فلاں کے سوا

چراغوں کا دھواں ہونے لگے ہیں
تو ہم کیا رائیگاں ہونے لگے ہیں؟

رسائی لفظ تک بڑھنے لگی ہے
سخن معجز بیاں ہونے لگے ہیں

حضور و غیب کے اس سلسلے میں
مکیں اب لامکاں ہونے لگے ہیں

مداراتِ بدن سے فائدہ کیا
یہ لشکر بے اماں ہونے لگے ہیں

بچائیں خاک کیا موجِ فنا سے
یقیں کے بُت گماں ہونے لگے ہیں

غبارِ عشق بڑھتا جا رہا ہے
ہم اپنے میں نہاں ہونے لگے ہیں

تِری وحشت نگاہی کے سہارے
خراباتِ جہاں ہونے لگے ہیں

❁

رموزِ خاک نے تشہیر اِک اداسی کی
بدن ہے عشرتِ تعمیر اِک اداسی کی

جہانِ حرفِ معانی سے دے رہائی اُسے
غزل نے کھینچی ہے تصویر اک اداسی کی

تمھارے نقشِ قدم کھنچ گئے تھے آنکھوں میں
بنانے بیٹھی تھی تصویر اِک اداسی کی

نشاطِ کارِ جنوں لُٹ نہ جائے درد مرا
خلل پذیر ہے تاثیر اِک اداسی کی

بہت سے دیدۂ حیران میں تماشے ہوئے
جنوں نے پہنی تھی زنجیر اِک اداسی کی

گُلوں کی آنکھوں میں آنسو دکھائی دینے لگے
ہوا نے لکھی جو تحریر اِک اداسی کی

آرزوؤں کو رونا پڑتا ہے
درد دل میں سمونا پڑتا ہے

چاہے جُھک جائے یہ کمر لیکن
عمر کا بوجھ ڈھونا پڑتا ہے

بسترِ گُل پہ سونے والوں کو
اوڑھ کر خاک سونا پڑتا ہے

سطحِ آئینہ صاف رکھنے کو
چہرہ اشکوں سے دھونا پڑتا ہے

اس کو پانے کی شرط ہے یہ کڑی
اپنی ہستی کو کھونا پڑتا ہے

(کرونا کے موسم میں)

شمعِ ہستی نے آواز دی زندگی!
اور اندھیرے میں روشن ہوئی زندگی!

ٹوٹتی سانس سے یہ صدا آئی بس
زندگی ! زندگی ! زندگی ! زندگی!

آئینہ چشمِ حیرت سے پوچھا کِیا
تم بتاؤ کہ کیسی لگی زندگی؟

دوستوں سے ملاقات ممکن نہیں
حبسِ تنہائی میں گُھٹ گئی زندگی

موجِ آگہی آدھے رستے میں ہے
اِک دریچے سے کہنے لگی زندگی

صرف شہرِ خموشاں ہی آباد ہے
اور خاموش ہے چیختی زندگی

دھوپ کا ہم کو احساس ہی نہ ہوا
ایک پیپل تلے کٹ گئی زندگی

وقت کے اِس تماشے کے کردار ہیں
کیا تری زندگی ! کیا مِری زندگی

(کرونا کی وبا کے زمانے کی)

کبھی خدا کبھی خلقِ خدا کو ڈھونڈا کیے
مریض مرنے سے پہلے دوا کو ڈھونڈا کیے

عجیب دور عجب ابتلا کی صورت ہے
اِدھر اُدھر کسی آوازِ پا کو ڈھونڈا کیے

ہماری گوشہ نشینی پہ حرف آنے لگا
چراغ جلنے کی خاطر ہوا کو ڈھونڈا کیے

قفس میں دامِ تمنا نے سُرخرو رکھا
فریبِ موسمِ گل میں صبا کو ڈھونڈا کیے

تمھارا بارِ محبت اُٹھائے کاسہ بدوش
سُبک سری میں کسی ناخدا کو ڈھونڈا کِیے

سراپا نازِ مجسم نیاز لوگ ترے
اُٹھائے سر کسی کرب و بلا کو ڈھونڈا کِیے

جو بارگاہِ محبت میں گم شُدہ ہوئے تھے
وہ ابتدا کو کبھی انتہا کو ڈھونڈا کِیے

سپاٹ ہو گیا ساقی گروں کا لہجہ بھی
ہم اُن میں غمزہ و ناز و ادا کو ڈھونڈا کِیے

درونِ ذات خلا کا یہ ہو گیا عالم
سکوت میں بھی کسی ہم نوا کو ڈھونڈا کِیے

لفظ جب اپنے معانی سے بچھڑ جاتے ہیں
کتنے کردار کہانی سے بچھڑ جاتے ہیں

گھر مہکنے بھی نہیں پاتا ابھی پوری طرح
اور سب رات کی رانی سے بچھڑ جاتے ہیں

اِک تعلق کو نبھاتے ہوئے مشکیزے سے
ہائے وہ ہونٹ جو پانی سے بچھڑ جاتے ہیں

قصرِ حیرت میں سلامت نہیں رہتی آنکھیں
اشک جذبوں کی روانی سے بچھڑ جاتے ہیں

❁

وصال لمحے کا زخم دل پر لگا ہوا ہے
یہ ہجر تو جیسے جان لیوا بنا ہوا ہے

تمھاری ترجیح غالبًا اب بدل چکی ہے
جو نام اوپر تھا سب سے نیچے لکھا ہوا ہے

نویدِ صبحِ بہار پر مطمئن نہ ہونا
یہاں ابھی تک تو گلستاں میں بُرا ہوا ہے

خود آگہی تو شکار کر بھی چکی ہے کب کا
گریز پائی کا روگ دل کو لگا ہوا ہے

اسی کے نقشِ قدم ہیں زنجیر راستے کی
غزال جو دشتِ دل سے میرے جُدا ہوا ہے

نیزوں سے تعبیروں کے سر لے جاؤ
اپنے اپنے خواب اُٹھا کر لے جاؤ

صرف محبت کی گنجائش ہے گھر میں
مذہب، مسلک ، نفرت باہر لے جاؤ

جانے والے آ نہیں سکتے ہو لیکن
آنکھوں سے جانے کا منظر لے جاؤ

دشت میں کوزے خشک پڑے ہیں حسرت سے
پیاس کی شکل سجانے کو گھر لے جاؤ

سینے پر اِک بوجھ سا اکثر رہتا ہے
یاد کا اپنا بھاری پتھر لے جاؤ

مل جائے اظہار کی آزادی اُن کو
موت کا سہمے لوگوں سے ڈر لے جاؤ

امن کی خاطر جنگ کہاں تک لڑنی ہے
آؤ آ کر خیر زدہ شر لے جاؤ

ایک سناٹا سا تقریر میں رکھا گیا تھا
خواب ہی خواب کی تعبیر میں رکھا گیا تھا

آ گہی روز ڈراتی رہی منزل سے مگر
حوصلہ پاؤں کی زنجیر میں رکھا گیا تھا

ساز و آواز کے ملنے سے ہی ہوتا ہے اثر
تیرا لہجہ میری تحریر میں رکھا گیا تھا

کون بسمل تھا بتا ہی نہیں سکتا کوئی
زخمِ دل سینۂ شمشیر میں رکھا گیا تھا

ایک منظر میں خلا پُر کیا تنہائی نے
میرا چہرہ وہیں تصویر میں رکھا گیا تھا

دامنِ حُسنِ طلب زخم کی دولت کے سوا
درد بھی عشق کی جاگیر میں رکھا گیا تھا

زندگی موت کے پہلو میں نمو پاتی رہی
اِک خرابہ یہاں تعمیر میں رکھا گیا تھا

خود پرستی سے بچاتا رہا ہمزاد مرا
آئینہ نسخۂ اکسیر میں رکھا گیا تھا

عدل کے نام پہ دریوزہ گری بڑھ رہی ہے
عہدِ آشوب میں آشفتہ سری بڑھ رہی ہے

آئینہ ہائے تغافل ترے بے فکروں میں
خودسری بڑھ رہی ہے خودنگری بڑھ رہی ہے

جوہرِ دیدۂ حیران ترے شوق کی خیر
زندگی گھٹ رہی ہے دیدہ وری بڑھ رہی ہے

دولتِ گردشِ اظہار لہو کی گردش
دائرہ وار مری بے ہنری بڑھ رہی ہے

حیرتِ چشمِ غزالاں تیری حیرت کی قسم
کیا خبر تجھ کو نہیں بے خبری بڑھ رہی ہے

ہائے سالار تغافل نہیں اچھا تیرا
قافلہ لٹ رہا ہے، نوحہ گری بڑھ رہی ہے

اے خاک بتا گوہرِ نایاب کہاں ہیں
دل ڈوب رہا ہے مرے احباب کہاں ہیں

جو عالمِ وحشت میں بھی دم سازِ جنوں تھے
وہ دل زدگاں واقفِ آداب کہاں ہیں

آئینۂ ایام پہ ہے گردِ ندامت
گم گشتۂ عکسِ دلِ بیتاب کہاں ہیں

کب دیدۂ حیراں میں ہے تعبیر کا سودا
بس اتنا بتا دو کہ مرے خواب کہاں ہیں

آرائشِ دل زینتِ محفل نہیں ملتے
جو بزم کو کرتے رہے شاداب کہاں ہیں

ترکیب کوئی سحر طرازی کی بتاؤ
تاریکیِ شب اختر و مہتاب کہاں ہیں

اندھیری رات ہے روشن ستارے کھو رہے ہیں
سفینہ ڈوبنے کو ہے کنارے کھو رہے ہیں

یہ بستی گم شدہ لوگوں کی بستی ہو چکی ہے
یہاں ترتیب سے سارے کے سارے کھو رہے ہیں

یہاں وحشت نگاہی کر رہی ہے رقصِ گریہ
نظر محوِ خلا ہے اور نظارے کھو رہے ہیں

بہت افسوس ہے سمجھوتا تم سے کر لیا ہے
سخنور چُپ ہیں اور پیارے ہمارے کھو رہے ہیں

خدا کے نام پر پھر کھیل کھیلا جا رہا ہے
بنامِ بندگی وحشت کے مارے کھو رہے ہیں

مجھے لکھنی ہے رودادِ محبت کیسے لکھوں
گل و خوشبو کے سارے استعارے کھو رہے ہیں

صورتِ شوخیِ بیباک سنبھالے ہوئے ہیں
اِک خرابے کی جو ہم خاک سنبھالے ہوئے ہیں

قطرۂ آبِ تمنا کا بھرم رکھنے کو
کوزہ گر کب سے یہاں چاک سنبھالے ہوئے ہیں

چاہِ اُمید سے یوسفؑ کی خبر سننے کو
ایک خوشبو بھری پوشاک سنبھالے ہوئے ہیں

کچھ زمیں زاد اُٹھائے ہوئے ہیں عشق کا بوجھ
کچھ زمیں زاد ہی افلاک سنبھالے ہوئے ہیں

ہائے کم ظرف سے ساغر بھی سنبھالا نہ گیا
ہائے وہ پیڑ! کہ جو تاک سنبھالے ہوئے ہیں

غفلتِ جلوۂ رنگیں کی تلافی کے لیے
بے دلی سے خس و خاشاک سنبھالے ہوئے ہیں

موجِ بیتاب کنارے سے لگا دے ان کو
کب سے جو دیدۂ نمناک سنبھالے ہوئے ہیں

❁

لامکاں کو کسی امکان میں لاتی ہوئی میں
روشنی کی طرح رستے کو بتاتی ہوئی میں

اپنے اندر کی فضاؤں میں سماتی ہوئی میں
پر سمیٹے کسی پرواز کو جاتی ہوئی میں

دولتِ درد کو سینے سے لگاتی ہوئی میں
زخم کو سب کی نگاہوں سے چھپاتی ہوئی میں

زینہ در زینہ دبے پاؤں اُفق زادوں کو
اپنا افسانہ حقیقت میں سناتی ہوئی میں

مثلِ خوشبوئے چکیدہ وہ مرا کم آمیز
اور ہواؤں کی طرح شور مچاتی ہوئی میں

آئینہ خانے سے ہر عکس مٹاتا ہوا وقت
ریت پر اپنے خدوخال بناتی ہوئی میں

بے نیازانہ بلندی کی طرف مائل دل
اور محراب میں سر اپنا جھکاتی ہوئی میں

آئینہ داری کا فن خوب نبھاتا ہوا وہ
موجۂ رنگِ ادا خود میں اڑاتی ہوئی میں

وہ جو محرومِ تماشائے تمنا ٹھہرے
چشمِ بینا سے انھیں خواب دکھاتی ہوئی میں

چل اپنی راہ لے اِس بد دماغ سے نہ الجھ
ہوائے محرمِ شب تُو چراغ سے نہ الجھ

کہا تھا تجھ سے بہت شور اس سے نکلے گا
بھری ہے تشنگی ، خالی ایاغ سے نہ الجھ

ستارہ سازیِ کارِ ہنر میں ہے مصروف
گرفتہ دل ! مری شامِ فراغ سے نہ الجھ

سرائے خانۂ قدرت ہے رنگ اور خوشبو
نموئے دستِ خزاں، کنجِ باغ سے نہ الجھ

یہ جسم و روح کی دنیا ہے اِک فریبِ جہاں
تلاشِ ذات میں راہِ سُراغ سے نہ الجھ

شبِ فراق یہی روشنی لٹائے گا
ہوائے خیمۂ جاں دل کے داغ سے نہ الجھ

❁

اتنی دریائے تمنا میں ہے ہلچل مرے دوست
موجِ حسرت سے ہوا دل میرا جل تھل مرے دوست

تو کبھی مجھ کو بناتا ہے کبھی توڑتا ہے
کر لے اِک بار خرابے کو مکمل مرے دوست

اُفقِ دل پہ بہت دیر چمکنے والے
ایسے ہوتا ہے کوئی آنکھ سے اوجھل مرے دوست

تیری یادوں کے پرندے نہ کہیں اُڑ جائیں
دل کے صحرا پہ ذرا بھیج دے بادل مرے دوست

رفتہ رفتہ جو ترے وصل کا سودائی ہوا
اُس کو اب ہجر بنا ڈالے نہ پاگل مرے دوست

بس اِسی دُھن میں لگی رہتی ہے خلقت ساری
کیسے خوشبو کو کیا جائے مقفل مرے دوست

چشمِ وحشت میں تب و تاب نہیں دیکھیں گے
آج کے بعد کبھی خواب نہیں دیکھیں گے

ہجر کی شام گزاری تو چراغوں نے کہا
آپ اب اختر و مہتاب نہیں دیکھیں گے

ابرِ نیساں صدفِ دل پہ نہیں برسے گا
اور ہم گوہرِ نایاب نہیں دیکھیں گے

ناقۂ وقت بھی رک جائے گا چلتے چلتے
زندگی تیرے بھی اسباب نہیں دیکھیں گے

دلِ درویش میں نغمے کی اَنی ٹوٹے گی
سازِ لَے صورتِ مِضراب نہیں دیکھیں گے

خاک پر خاک کا پیوند لگائیں گے سبھی
پھر بدن اطلس و کمخواب نہیں دیکھیں گے

خلعتِ تشنگیِ شوق پہننے والے
جانبِ ساغرِ کمیاب نہیں دیکھیں گے

شوق کے دشت میں وہ خاک اڑے گی ہر سُو
کشتِ دل اب تجھے شاداب نہیں دیکھیں گے

ہوائے درد سرِ شام گفتگو کرے ہے
بہار زخمِ تمنا مرا رفو کرے ہے

چراغ میرا ہواؤں کے رُو برُو کرے ہے
وہی تو دوست کرے ہے کہ جو عدو کرے ہے

ہر ایک موج کی چھاگل میں اشک بھر آئے
یہ کس کی تشنگی دریا کو سُرخ رُو کرے ہے

جمالِ حُسنِ تماشا بھی گاہ گاہ کہاں
کمالِ دیدہ وری بھی کبھو کبھو کرے ہے

مثالِ بادِ صبا مجھ سے وہ گزرتے ہوئے
یہ اہتمامِ تقاضائے رنگ و بُو کرے ہے

تمام عمر تعاقب میں وقت کے گُزری
زمانہ زاد بدن کیسی جستجو کرے ہے

میں خود کلامی سے بیزار ہوتی جا رہی ہوں
کہاں تلک کوئی اپنی ہی جستجو کرے ہے

سپردِ خاک بدن کر دیا ہے پھولوں کا
یہ وقت خاک سے ہی خاک کو رفو کرے ہے

❁

(میرؔ صاحب کی نذر)

بالیدگیِ شوق کے اسباب لے گیا
اِک شخص اپنے ساتھ مرے خواب لے گیا

تھیں کوچۂ وجود میں کچھ سرگرانیاں
پھر وقت سارا چھین کے اسباب لے گیا

پندارِ ضبط ٹوٹا تو احساس یہ ہوا
وہ حادثہ تو قوتِ اعصاب لے گیا

سرطان جھیلتے ہوئے اُس نے کہا تھا یہ
آئینہ میری ساری تب و تاب لے گیا

صاحب ہمیں بھی ناز تھا اپنے وجود پر
سارا غرور لمحۂ ایجاب لے گیا

❁

سمندر بِک گیا لہروں کا سودا ہو گیا ہے
تجارت میں ہمارے ساتھ دھوکا ہو گیا ہے

سب اپنے اپنے یوسفؑ کی دعائیں مانگتے ہیں
وطن بُردہ فروشوں کا ٹھکانا ہو گیا ہے

کہاں ہیں اپنی گلیاں اور اپنے لوگ میرے
زمیں سے آسماں تک سب پرایا ہو گیا ہے

چراغوں کو بجھانے کا ہدف ہے کتنا باقی
سیاہِ شام بستی میں اندھیرا ہو گیا ہے

ہمارے گھر کی قیمت کچھ نہیں اُس کی نظر میں
مگر ملبہ ہمارے گھر کا مہنگا ہو گیا ہے

موسمِ گل مرے احساس پہ چھایا ہی نہیں
جیسے آنا تھا اُسے اُس طرح آیا ہی نہیں

محملِ دل میں تھی لیلائے تمنا کب سے
قیس جیسا کوئی پھر دشت میں آیا ہی نہیں

وحشتِ عہدِ تمنا نے خبردار رکھا
تیری دنیا میں کبھی دل کو لگایا ہی نہیں

کور چشموں میں ہنر آئینہ دکھلا نہ سکا
ہم نے تمثیل میں کردار نبھایا ہی نہیں

کتنے قِصّے کہے اور خواب سُنائے کتنے
جو سنانا تھا وہ افسانہ سنایا ہی نہیں

دل خرابے میں یاس ہو گئی ہوں
اپنے ملبے کے پاس ہو گئی ہوں

اُس کی فرقت سے والہانہ ملی
کس قدر بدحواس ہو گئی ہوں

اِک یقیں سے بچھڑ کے ایسا ہوا
میں قرینِ قیاس ہو گئی ہوں

دائرہ وار رقصِ بسمل ہے
کس قدر خود شناس ہو گئی ہوں

زخم پر زخم لگ رہے ہیں مگر
میں سراپا سپاس ہو گئی ہوں

روح زندانِ جسم سے بولی
ڈھانپ لے بے لباس ہو گئی ہوں

پی کے دریائے شوقِ آگاہی
دیکھ خالی گلاس ہو گئی ہوں

وقتِ موجود میں نہیں موجود
عہدِ ماضی کی آس ہو گئی ہوں

لالہ وگُل میں اُترنے لگا پُروائی کا رنگ
چڑھ چکا ہے مری پوشاک پہ سودائی کا رنگ

میرے چہرے کے تاثر سے کوئی کیا سمجھے
وہ تماشا ہوں کہ جس پر ہے تماشائی کا رنگ

جوہرِ آئینہ حیرت سے تکا کرتا ہے
کچا نکلا ہے مری قامت و زیبائی کا رنگ

ہم کو دشوار پسندی تھی سہل تیرے لیے
عشق میں دل نے گوارا کیا رسوائی کا رنگ

در و دیوار پہ ہے شامِ اداسی طاری
سُرمئی رہنے لگا ہے مری انگنائی کا رنگ

خانہ ویرانی بتائی تو نہیں جا سکتی
دیکھ کر مجھ کو سمجھ لو غمِ تنہائی کا رنگ

کچے رنگوں کی شکایت نہیں رنگریز مرے
خاک پہ چڑھتا ہے بس بادیہ پیمائی کا رنگ

کل تری یاد کے رنگوں میں نہائی ایسے
میرے عارض پہ برسنے لگا ہرجائی کا رنگ

رائیگانی کی عجب شکل دکھائی گئی ہے
ایک تصویر جو پانی پہ بنائی گئی ہے

وہ تبسم بھرے لب اور وہ چشمِ پُرنم
بات کچھ اور ہے کچھ اور بتائی گئی ہے

شہرِ آشوب کے کردار نئے ہیں لیکن
یہ کہانی ہمیں پہلے بھی سنائی گئی ہے

خانۂ دل میں خدا اور صنم دونوں تھے
ایک دیوار حقیقت میں اٹھائی گئی ہے

ایک عرصے سے تعاقب میں رہی وحشتِ دل
دشت سے اُٹھ کے کہاں آبلہ پائی گئی ہے

ہائے ویرانۂ میخانہ کی خاطر آخر
خود فریبی تری محفل سے منگائی گئی ہے

بقدرِ حُسن کہانی میں گونجتا ہے بہت
سکوتِ حرف معانی میں گونجتا ہے بہت

تری نگاہ کا لہجہ خیال میں آ کر
مرے لہو کی روانی میں گونجتا ہے بہت

شہودِ عہدِ گزشتہ بھی جانتے ہیں سبھی
جنوں کا ساز جوانی میں گونجتا ہے بہت

ہمارا عکس سرِ آئینہ سنورتے ہی
فضائے عالمِ فانی میں گونجتا ہے بہت

تمھاری یاد کا نغمہ بہت سلیقے سے
کسی پرانی نشانی میں گونجتا ہے بہت

تغارچے سے جو مٹی اڑائی جا رہی ہے
تو رائیگانی کی صورت بنائی جا رہی ہے

سبوچے لاؤ نمو کے اُسے لُنڈھائیں ذرا
ہمارے خواب کی قیمت لگائی جا رہی ہے

قلم سے زخم کو کرنا پڑا رفو سائیں
یہ مجھ میں کون رہا محوِ گفتگو سائیں

میں تیرے پیار کی اجرک گلے میں ڈالے ہوئے
جو خود کو دیکھوں نظر آئے تو ہی تُو سائیں

ہر ایک لمحۂ موجود نے کیا معدوم
فنا کا سلسلہ پاتا رہا نمو سائیں

صلیبِ وقت پہ تم نے جِسے چڑھایا تھا
وہ سر اُٹھاتا ہے دل میں کبھو کبھو سائیں

بنامِ تشنہ لباں جُرعہِ تمنا یہاں
پکارا کرتا ہے اکثر سُبو سُبو سائیں

کہاں پہ وادیِ وحشت میں ہے قیام لکھا
کب اہلِ ہجر کو ہونا ہے سُرخ رُو سائیں

بھری بہار میں اندیشۂ خزاں کے سبب
خلل پذیر تمنائے رنگ و بو سائیں

یہ عشق ہے یہاں تقدیس شرطِ اوّل ہے
یہاں خیال بھی رہتا ہے با وضو سائیں

چراغِ تشنگیِ دل نہیں ہے داغ سے خوف
رہینِ ساقی ہے ٹھہرے ہوئے ایاغ سے خوف

اندھیری رات اُجالے سے ڈرتی ہے لیکن
کسی چراغ کو ہوتا نہیں چراغ سے خوف

شمیمِ فکر نسیمِ ہُنر ہیں خیر طلب
ہر ایک پھول کو آنے لگا ہے باغ سے خوف

قلم فروشوں کا مجمع لگا ہے چاروں طرف
امیرِ شہر بچارے کو ہے دماغ سے خوف

عشق جب سُبحہ و تہلیل سے باہر آئے
روشنی پھر کسی قندیل سے باہر آئے

بارہا ایک ہی کردار نبھاتے ہوئے لوگ
تنگ آ کر کسی تمثیل سے باہر آئے

وہ بھی زندانِ محبت کی اسیری سے چُھٹا
ہم بھی سرشاریِ تعمیل سے باہر آئے

لمحہ لمحہ کسی تعبیر کی سرمستی میں
خواب تلخابہِ تشکیل سے باہر آئے

مجھ سے ملبوسِ عقیدت کی مہک کہتی ہے
کاش! یوسفؑ مرا تعجیل سے باہر آئے

بابِ ساعت

یاد کی ایڑیاں
دشت میں چلتے چلتے ہوئے گِھس گئیں
اور آنکھوں میں
خوابوں کے شہزادے مرنے لگے
نارسائی کے خنجر نے پھر
گردنِ آرزو کو قلم کر دیا
روشنی کی صدائیں ہویدا ہوئیں
لمسِ اُمید سے مجھ کو
چلنے کی طاقت عطا کی گئی
بابِ ساعت پہ لیکن میں آگے نہیں بڑھ سکی
کھا گئیں، مجمعٔ عام کی

تِیر جیسی نگاہیں مجھے کھا گئیں
مجھ کو پھر ......
اپنے بالوں سے، چہرہ چھپانا پڑا
کیونکہ
اندھوں کی بستی میں چاروں طرف آئینے تھے لگے
جن میں، مَیں تھی
جو
آئینہ دیکھنے اور دکھانے کی صورت سے آگاہ تھی
بابِ ساعت سے آگے
ازل سے ابد کی طرف مجھ کو چلنا پڑا
اور
اندھوں کی بستی میں مجھ کو تماشا بنایا گیا

آنکھوں کی ایش ٹرے میں

بہت سی نظمیں کہی تھیں جو
ان کہی رہ گئیں ورق پر
بہت سے افسانے زندگی کے
حقیقتوں کو تلاشنے میں کھو گئے ہیں
صدائے اظہار
صورِ اسرافیل بن کے
کسی حشر امکاں گھڑی کی منتظر ہے
بہت سے خوابوں کی راکھ
آنکھوں کی ایش ٹرے میں
جلی بجھی سگریٹوں کی صورت پڑی ہوئی ہے

دکانِ دل بند کرنے کا وقت ہو چکا ہے
سو مجھ سے تنگ آ کے مری ہمزاد نے
نوادرات کو نیلام کر دیا ہے
کباڑیئے کی دکان پر مالِ مفت مل رہا ہے
پرانا سامان بِک رہا ہے
کساد بازاری کی وجہ سے
مالِ مفت مل رہا ہے

خوفناک حُسن

Terrible Beauty

القاعدہ! اب بے فائدہ ہے
آزاد مارکیٹ میں
صابن، روٹی اور پانی تک کی قیمتیں بڑھ گئی ہیں
اور
اظہارِ رائے بھی برائے فروخت ہے
کارپوریٹ عالمگیریت میں
غم کی تجارت
درد کا سودا اور دُکھ کا کاروبار
تیزی سے پنپ رہا ہے

شاید مجھے اور میرے ہم نوا ساتھیوں کو بھی
فکر کی آزادی کے اثاثے سے دستبردار ہونا پڑے
کیونکہ ہم تیل کا کنواں نہیں
جس کی حفاظت خود فاتح کرتے ہیں
ہم تو
میسوپوٹامیا، بابل، دجلہ اور فرات ہیں
وہ قدیم تہذیب
جِسے، بم برسا کر راکھ کرنے کی کوشش کی گئی
ہم جنگ کا وہ خوفناک حُسن ہیں
جس کے عقب میں بم پھٹ رہے ہیں
سب خوف زدہ ہو کر بھاگ رہے ہیں
اس وحشت زدہ دوڑ میں
کوئی کہیں جا نکلا ہے اور کوئی کہیں
میرے دامن میں آگ لگ چکی ہے
ایک وحشی غزال کی طرح
سر کٹے لاشوں کے درمیان راستہ ڈھونڈ رہی ہوں
شامِ تنہائی میں
کُرتے کا دامن جل چکا ہے
اور اُس کی روشنی میں

آنکھوں کے آنسو چمک اُٹھے ہیں
اور پھر
مجھے ایک مصوّر نے
وقت کی قید میں تصویر کر دیا ہے
اُسے
اِس تصویر پر پہلا انعام ملا ہے
میرے بے قیمت آنسو
آزاد مارکیٹ میں انمول قیمت میں
فروخت ہو رہے ہیں۔

ادھوری نظم

وقت کے ملبے میں کچھ حرفِ تمنا دب گئے
جو کنایہ کار سے لمحے تھے عرضِ حال کے
رمز و معنی کا سلیقہ ڈھونڈنے میں کٹ گئے
مصرعہ ہائے نظم سب کاغذ پہ گونگے ہو گئے
کچھ سسکتے قافیے تھے جو ادا نہ ہو سکے
کچھ ردیفوں نے سخن کی پاس داری چھوڑ دی
وقت ضائع کر دیا حرفِ نمو کے واسطے
یوں جبینِ شعر پر سلوٹ پڑی افکار کی

چشمِ نم ہر ایک نظارے سے غافل ہو گئی
شام کے سائے تلے دیوارِ جاں کے آس پاس
اک ادھوری نظم کی آواز آتی ہے مجھے
کون تکمیلِ تمنا کی بشارت لائے اب
وقت ضائع کر دیا حرفِ نمو کے واسطے

’’ہاں دوست ایسا ہی تھا‘‘

پتھروں کی اپنی ایک دنیا ہوتی ہے
اُن کے اٹامک نمبرز سے
اُن کی قیمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے
واشنگٹن کے عجائب خانے میں
قیمتی پتھروں کی گیلری ہے
کسی ملکہ کا نیکلس
کسی بادشاہ کا تاج
کسی شہزادی کے آویزے
اور
کسی رئیس زادے کی قیمتی مالا رکھی ہوئی ہے
جن کی چمک سے سارا ماحول
بقعۂ نور بن چکا ہے

ہیرے کی چمک
تماش بین کی آنکھوں کو چکاچوند کر رہی ہے
نیلم کی نیلاہٹ نظر کو ساکت کر چکی ہے
یاقوت کی سُرخی
محبوب کے یاقوتی ہونٹوں کی طرح
بوسے کی طرف مائل کر رہی ہے
اور
زمرد کی سرسبزی دیکھنے والے کو شاداب نظر کر رہی ہے
مرا دوست مجھے
ہر پتھر کی قیمت اور اس کا اٹامک نمبر بتا رہا ہے
پتھروں کی چمک میں تکبرانہ مسکراہٹ ہے
کیپٹل ہل کی عمارت کے ہر گوشے میں
سرگوشیاں گونج رہی ہیں
ستون!
جن پر گمنام غلاموں کے دستخط ہیں
وہی بے زبان نشان گونج رہے ہیں
اسی طرح
میرے عظیم مفکر ''شریعتی'' نے سنا تھا کہ

اہرامِ مصر کی آغوش میں
ہزار ہا مزدور قبروں میں رو رہے ہیں
اور بہرے تماشائی تماشا دیکھ رہے ہیں!!!
ہاں دوست!
تمام بے قیمت پتھروں کی کہانی ایک سی ہے
غلامی کے شعبے کی نجکاری ہو چکی ہے
غلام آج بھی بِک رہے ہیں
تمام سُود و زیاں سے عاری غلام بِک رہے ہیں
آئی ایم ایف کی چیک بُک
اور کروز میزائل
ان غلامی کے کوڈ بردار جنس کے
اٹامک نمبر کو طے کریں گے

نور کی خوشبو

تم مری نظم سنو! تم مری نظم سنو
لفظ کی مالا میں ہے نور کی خوشبو گوندھی

اُس کے وعدے کی مہک، بیلا، چنبیلی جیسی
اُجلے کرتے کی کرن آنکھوں کو خیرہ کرتی
چمپئی یاد کی آہٹ مجھے چونکاتی ہوئی
رنگ اور نور ملایا تو مری نظم بنی
آنکھ کو خوشبو دکھانا ہے تو پھر نظم سنو

تم مری نظم سُنو ...
نور محبوب کا مصرعے مرے چمکاتا ہے
چاند چہرہ کوئی کاغذ پر اتر آتا ہے

بانوئے فن کو شہر یارِ سخن پاتا ہے
وہ ضیا بار سا لہجہ جو مجھے بھاتا ہے
موجۂ نور اڑاتا ہی چلا جاتا ہے
اس کا ہر عکس مری نظم پہ چھا جاتا ہے
نور کے عکس سے ملنا ہے تو پھر نظم سنو

تم مری نظم سُنو ...
جو ہے لفظوں میں ارادت مرے محبوب کی ہے
اور غزلوں میں وجاہت مرے محبوب کی ہے
ورقِ دل پہ کتابت مرے محبوب کی ہے
چشم و ابروئے فصاحت مرے محبوب کی ہے
زیرِ لب کیسی بلاغت مرے محبوب کی ہے
حُسن سے عشق سمجھنا ہے تو پھر نظم سنو
تم مری نظم سُنو ...

نظم

انصاف کا ہیرا تو کیسا انمول ہے
وہ سامنے خاک پر
ایک کٹی ہوئی انگلی میں جگمگا رہا ہے
انگلی کی پور پور سے خون بہہ رہا ہے

مذہب، سیاست حد یہ ہے کہ
محبت کے بازار میں بھی
سرمایہ
سرمایہ دار پر سبقت لے گیا ہے

حُسنِ ظاہری، باطنی افلاس کو چھپانے میں مگن ہے
سُخن پروری کے لیے راتب مہیا کرتے کرتے
میری شاعری بھی مجھ کو نگل چکی ہے
سرمایہ
سرمایہ دار پر سبقت لے گیا ہے!!

نظم

رات کچھ بچھڑے ہوئے خوابوں سے پیمان ہوئے
دیر تک غور سے اِک دوسرے کو دیکھا کیے

اُس کی آنکھوں نے محبت کے سبق دُہرائے
میری آنکھوں نے بہت دیر تلک اُس کو پڑھا
ایک پیغام مجھے تم سے محبت ہے بہت
دوسرا یہ کہ تمھیں پانے کی حسرت ہے بہت
ان محبت کے سبق رٹتی ہوئی آنکھوں سے

میں نے بس اتنا کہا کاش ہو ادراک تمھیں
یہ محبت بھی عجب شئے ہے کہ پھر اس کے بعد
کسی پیغامِ تمنا کی ضرورت ہی نہیں
حالتِ حال بیاں کرنے کی حالت ہی نہیں

ان لکھی بات جو لکھی تھی نہیں پڑھ پائے
دل صحیفے کی تلاوت ہی نہیں کر پائے
اب کسی خواب کو دُہرانے سے حاصل کیا ہے
اَن کہی بات بیاں کرنے میں مشکل کیا ہے
عہدِ تجدیدِ محبت کی ضرورت کیا ہے!!!

عصرِ حاضر کی قتل گاہ

مری ماں تُو بڑی خوش بخت تھی
پچھلے برس راہِ خدا میں مر گئی تھی

تجھے کفنایا تھا اور قبر میں تجھ کو اتارا تھا
لحد پر تیری رحمت ہو خدا کی
مگر ماں اب تو سب کے گھر ہی سب کی قتل گاہیں ہیں
مرا بیٹا مری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا ہے
ٹنوں مٹی کے ملبے میں کہیں وہ کھو گیا ہے

نہیں معلوم زندہ ہے کہ مُردہ ہے؟!
مری ماں اب اجازت دے
مجھے ملبے سے کچھ پتھر جمع کرنے ہیں
تاکہ عصر کے شیطان کو ماروں، یہی پتھر ہمارا اسلحہ ہے
میری ماں اب مسلسل سب یہاں
احرام کی حالت میں ملتے ہیں
طفل کو قربان کرتے ہیں
کسی کی آنکھ پر پٹی نہیں دیکھی
مگر اب روشنی آنکھوں سے رخصت ہوتی جاتی ہے

Trick or Treat

تہذیبیں کبھی ٹکراتی نہیں
اُن کا حُسن بس اِسی میں ہوتا ہے
کہ وہ
ایک دوسرے میں ضم ہو جائیں
اور بدتہذیبی؟؟؟
بدتہذیبی تصادم کا باعث بنتی ہے
تاریخ سرگوشیوں میں یہ بتاتی ہے کہ
۳۱ اکتوبر کو
یورپ کے باشندوں میں
فصلوں کی کٹائی کا دن ہوتا
سردی کا آغاز ہو جاتا

زرد پتے پیڑ سے ٹوٹ کر بکھر جاتے
اور نیا موسم
خزاں اور وبا کا پیام لاتا
موت اور زندگی کی سرحد نرم پڑ جاتی
کبھی یہ مقدس دن تھا
جسے All Saint's day کہا جاتا
مگر اب اِسے
Devil's night میں تبدیل کر دیا گیا
اور سرمایہ دارانہ نظام
بدتہذیبی کو فروغ دینے میں کامیاب ہو گیا
یہ ثقافتی تہوار سرمایہ دارانہ نظام کی بھینٹ چڑھ گیا
اور
اربوں ڈالر کا کاروبار بن گیا!!!
روپ دھارنے کے لیے
ہر طرف بد ہیئت ماسک
اور
Halowen costume بِک رہے ہیں
بدہیئتی اور وحشت کا بازار گرم ہے

اسی لیے لوگ
ایک Mall سے دوسرے مال جا رہے ہیں
بدصورتی کے خریداروں کی بھیڑ ہے

ہیلووین ۲۰۲۳ کے خریداروں نے
غزہ مال (Gaza Mall) کا رخ کرلیا ہے
یہاں سب کچھ دستیاب ہے
خاک اور خون میں لت پت لاشے
کٹے پھٹے اعضا
آگے بڑھو خریدارو!
وہ سامنے کچھ لوگ پلاسٹک کے تھیلوں میں
بچوں کے ٹکڑے لیے کھڑے ہیں
مفت میں لے لو کہ
باپ دفنانے کی زحمت سے بچ جائیں گے
وہ سامنے جسے آپ Halloween costume سمجھے ہیں
وہ تو بہت زوردار ہے
وہ دوڑتی ہوئی ماؤں کی پھٹی ہوئی ردائیں ہیں
آپ بتایئے آپ کو

سجاوٹ کے لیے غزہ مال سے کیا چاہیے ہے
غزہ کے حریت پسندوں نے
اس entertainment کی دنیا میں
حقیقت کا رنگ بھر دیا ہے
فصلوں کی کٹائی کے بجائے
نسلوں کی کٹائی کا تماشا جاری ہے

تم کو زندہ رہنا ہے

نہیں معلوم تم کھوئے ہو؟
یا میں گم شُدہ ہوں

ہر اِک دل میں چُھپا
اِک گوشۂ تنہائی ہوتا ہے
جہاں پر وقت کی گٹھری میں
جانے کون سے لمحے ہمیشہ
رنگ، خوشبو کو لیے آباد ہوتے ہیں

تمھاری آنکھ کے وہ سرخ ڈورے
اور بے حد بولتی آنکھیں بھی

اِک مدت ہوئی خاموش رہتی ہیں
تمھارے پیرہن کی سلوٹیں بھی
اب کسی صورت نہیں مٹتیں
وہ اِک مانوس سی خوشبو
ہمیشہ جاگتی رہتی ہے مجھ کو بھی جگاتی ہے
مری نظموں میں میرے بعد بھی
اس کو مہکنا ہے
تم اک شاعر کے ہو محبوب
تم کو زندہ رہنا ہے

نومبر۲۰۲۳ء

غزہ کے محکمۂ تعلیم نے اعلان کیا ہے
کہ
غزہ کے اسکول اب کبھی نہیں کھلیں گے
کیونکہ
اس میں پڑھنے والے سارے بچے مر چکے ہیں
اسکول کھنڈر بن چکے ہیں
امید، آس اور نویدِ صبح
خدا کو آواز دیتے دیتے تھک کر سو چکے ہیں

چلو تسنیم بیگم

چلو تسنیم بیگم یاد کی جو پوٹلی تم نے بنائی تھی
اُسے پھر سے نکالو
کہ جیسے جاڑے آتے ہیں
گھروں میں دھوپ لگنے کے لیے
سِیلے لحافوں اور گرم کپڑوں کو
صحن میں رکھا جاتا ہے
اُسی طرح سے اپنی قیمتی یادوں کو
اپنے دھیان کی چادر پہ پھیلاؤ

وگرنہ قیمتی یادوں میں بُھکراندی سی بدبو آنے لگتی ہے
انھیں محفوظ رکھنا ہے تو اپنے آنسوؤں کی دھوپ پہنچاؤ
سسکتے خوابوں کو تازہ ہوائے دل سے مہکاؤ
پھر
کسی بُڑھیا کی طرح پوٹلی میں باندھ کر رکھو
کہیں یہ حال کی شدت سے ضائع ہی نہ ہو جائیں

حنوطِ خواب

تلاش کا بلیک ہول اپنی جانب بلا رہا ہے
میں اپنی ذات کے خلاؤں کو بھرنے میں تھک چکی ہوں
دماغ کی اسکرین پر کچھ تیز بتیاں جل رہی ہیں
مگر اکثر
بجھ چکی ہیں
گھڑی کی سوئی
کسی ایک لمحۂ معدوم پر رک چکی ہے
بہت گھٹن ہے، حبس بڑھ رہا ہے

رسد رسانی کے سارے راستے مسدود ہو چکے ہیں
اندھیرا آنکھوں میں چھا رہا ہے
مگر افق پر روشنی نیلام ہو رہی ہے
حنوطِ خواب دل کے میوزیم میں
تماش بیں کے ہاتھوں مر رہے ہیں
تلاش کا سفر مجھ کو کھا گیا ہے
سُرنگ نور کی کیسے چھَب دکھا رہی ہے!!

زمستانی ہوا

جب خزاں آثار پتے ٹوٹ کر شاخوں سے گرتے ہیں
تو
سُوکھے پتوں کے اس شور میں
کچھ تعزیت کرنے والوں کے بین بھی شامل ہوتے ہیں
ہر پتا خود سے مل کر رو رہا ہے
شاید تسلی بھی مر چکی ہے
اسی لیے اب شاعری وقت کی سناؤنی بن چکی ہے
سجدۂ شوق سے عاری نماز

نمازِ جنازہ کی طرح ادا ہو رہی ہے
زمستانی ہوا
صورِ اسرافیل کی طرح لگ رہی ہے
پتے لگاتار ٹوٹ کر گر رہے ہیں
اور باغ پر افسردگی چھا چکی ہے
میرے سینے میں
الفاظ کی انی ٹوٹ گئی ہے

آواز کا دم گھُٹ رہا ہے

دل کو کاغذ پر اتار دیا ہے!!
اور اب سینے میں
خلا دھڑک رہا ہے
خلا میں خاموشی کی چیخیں گونج رہی ہیں
یہ خاموش چیخیں اپنی ماہیت بدل کر
اکثر آنکھوں کے راستے نکل آتی ہیں
میں اِن چیخوں کے ملبے میں دب گئی ہوں
مجھے اس ملبے سے باہر نکالو
آواز کا دم گھٹ رہا ہے

یومِ تشکر

Thanks Giving

کولونائزیشن کی جھاڑو پھر چکی ہے
پرانی تہذیب صاف ہو رہی ہے
خود ساختہ تہذیب کی درسگاہیں
غلاموں کو خود فراموشی کے سبق پڑھا رہی ہیں
میں تاریخ کے تہہ خانے میں جھانکتی ہوں
غلام گردشوں میں پلنے والی بغاوتیں رو رہی ہیں
تمام بردہ فروش بازار میں نقدِ زر گن رہے ہیں
کنیزیں بِک چکی ہیں

غلام نیلام ہو چکے ہیں
غریبSqvinto* بھی بے مول بِک چکا ہے
وہ اپنی ہی گلیوں اور اپنے ہی شہر میں اجنبی ہو چکا ہے
نجانے کتنے یوسفؑ اِسی طرح
فقط سُوت کی ایک انٹی پہ بِک چکے ہیں

قحط سالی سے جب پیچھا چھُوٹا
تو خدائے اقتصاد نے کہا کہ
سب اپنی اپنی گم شدہ تہذیب کے غموں کو بھول کر
جشن تو مناؤ
بغاوتوں کے گیت کے بجائے
نیو ورلڈ آرڈر کے ساز کو بجاؤ
مُرغِ فِیل (Turkey) کھاؤ
اور
نجات یافتہ مُرغِ فِیل کو اُڑاؤ
معافی** کی تقریب کی وجہ سے

---

* ایک ریڈ انڈین کردار
** Pardering Ceremony

بہت سارے مرغِ فیل کی قربانی کے بعد
ایک زندہ بچ گیا ہے
اُسے نویدِ زندگی دو
خدائے اقتصاد!
مرغِ فیل کو بچانے والے
یمن کی بستی اجڑ چکی ہے
یمن کے اب زندہ ڈھانچوں کو معاف کر دو

یہ دنیا یہ حقیر و بے وقعت دنیا

یہ دنیا یہ حقیر و بے وقعت دنیا
کہ جس کو مولاؑ نے ٹھکرا دیا تھا
اور کہا تھا
''یہ دنیا سانپ جیسی نرم ہے
چھونے میں دلکش ہے''
مگر زہرِ ہلاہل اس کے اندر ہے
یقیناً میرے مولاؑ نے کہا جو کچھ
ہمیشہ سچ ہی ہوتا ہے

یہ دنیا جہل کی آماجگاہ ہے
ظلم کی جائے پناہ ہے

ترقی یافتہ دنیا تمھاری
کیسی ظالم ہے؟؟!!
جہاں بچوں پہ بم برسا کے سب کو مار ڈالا ہے
ترقی یافتہ دنیا!!
تمھیں معصوم کلیوں کو مسلتے شرم نہ آئی
غزہ اِک شہر تھا لیکن
وہ اب بچوں کا قبرستان ہے!!!!

تم کب آؤ گے

شام ہوئی اور دل نے پوچھا
آخر تم کب آؤ گے
اِک اِک تارہ پوچھ رہا ہے
آخر تم کب آؤ گے

بادِ صبا کا کوئی جھونکا
خواب کے در پر دستک دیتا
میں تعبیر کے پھول کِھلاتی
اِک اِک پھول صدا یہ دیتا
آخر تم کب آؤ گے
ساون کے یہ گہرے بادل
دل پہ برسنے لگتے ہیں

من آنگن تو سُوکھا پڑا ہے
قطرہ قطرہ پوچھ رہا ہے
آخر تم کب آؤ گے

جیون کی یہ کیسی گھڑی ہے
کھڑکی میں حیرانی کھڑی ہے
مجھ پہ وقت کی گرد پڑی ہے
خالی رستہ پوچھ رہا ہے
آخر تم کب آؤ گے

نظم

اب اماوَس کی اس رات میں
ہم کو خود کو ہی چمکانا ہے
تا کہ دشتِ سفر میں
کہیں نہ کہیں تو پہنچ جائیں ہم

یہ ضروری نہیں ہاتھ جب ہوں حنا رنگ تو
پھر ملن کے لیے کوئی آنے کو تیار ہو
ان درختوں پہ کب سے پرندے چھپے بیٹھے ہیں

اس خزاں میں یہ سوچا ہے کہ
اب انھیں ہم اڑا کیوں نہ دیں!!
دل کے اندر عجب تان ہے
گیت کا درد سے بے سبب ربط ہے
ساز چھڑنے کی بس دیر ہے
جانے کتنے ہی نغمے
ادا جو نہیں ہو سکے
اب فضا میں بکھرنے کو تیار ہیں
اس دفعہ جب بہار آئے تو
بس یہی التجا دل کی ہے
پیار کے تم نتھارے ہوئے پانیوں سے
کسی تشنگی کو بجھانے کی کوشش تو کرنا
سنا ہے کہ وقتِ نزع
قطرہ قطرہ بہت ہوتا ہے

رنگوں کی دنیا

میں ایک آرٹسٹ ہوں
مجھ سے رنگ مت چھینو
تمھیں میرے رنگ
اور تصویر کے خدوخال پسند نہیں
کوئی بات نہیں
مجھے تم سے دادِ ہنر نہیں چاہیے
مگر
تم مجھے بد رنگا مت کرو
میرے خدوخال کو اپنی تنقید کے قلم سے
مسخ مت کرو
تم میرے نگارخانے میں
آخر کیوں آتے ہو؟

مجھے میرے خیال کی پرواز، قلم کی بیبا کی کے ساتھ
ہجومِ تنہائی میں سسکنے دو
اور تم!
اپنی محفلِ طرب میں بدمست ہو کر رقص کرو
میرے پر مت کاٹو
ورنہ ہوا میں کٹے ہوئے پر
سب کو میری شوقِ پرواز کا قِصّہ سنائیں گے
مجھے اپنے جیسوں میں خود کلامی کرنے دو
مجھے رنگوں سے کھیلنے دو
مجھے دل کا احوال لکھنے دو

ورنہ
کبھی کبھی سکوت اور خاموشی بھی
طوفان کا اثر رکھتی ہے
اور تم جیسے!!!
طوفانِ احتجاج سے ڈرتے ہیں

آنکھیں تم کو ڈھونڈیں ہیں رنگریز مرے

تیز ہوائیں
کالی گھٹائیں
بوندا باندی کی آوازیں
اکثر مجھ میں
وحشت کے آثار نمایاں کرتی تھیں
تم میرے یخ بستہ ہاتھوں کو
اپنے ہاتھ میں لے کر
اکثر کہتے تھے
تم!!

میری آنکھوں میں دیکھو !
موسم کتنا پیارا ہے
اور
آنکھوں کی وحشت
چاہت کے رنگوں میں رنگ جاتی تھی
تم کیسے ماہر ساحر تھے !!
میرے دل کے موسم کو رنگ دیتے تھے

آج بھی موسم
پہلے جیسا موسم ہے
اور تمھاری آنکھوں کو
میں ڈھونڈ رہی ہوں
دل کے موسم کو رنگ دے رنگریز مرے

سنا ہے!!

(بلوچستان کے تناظر میں کہی گئی نظم)

سنا ہے پتھر کا دور کب کا گزر چکا ہے
سنا ہے میں نے
زمانہ ترقی یافتہ ہو چکا ہے!!
سنا ہے اب
مصنوعی ذہانت کا جادو سر چڑھ کے بولتا ہے
سنا ہے اشرافیہ شاد ہیں
اور حقوقِ انسانی
سب کے کاسے میں کھنکھنا رہے ہیں
سنا ہے پوری دنیا
عالمی گاؤں بن گئی ہے
جہانِ اشرافیہ میں سب

شان وشوکت سے جی رہے ہیں
رئیس زادوں کو
عیش وعشرت ملی ہوئی ہے
سنا ہے کیا کیا؟!

مگر میرا جامِ جمشید یہ کیا دکھا رہا ہے؟
مرا سفینۂ دید ایک منظر پہ رک گیا ہے
یہیں کہیں غلامی کی میراث بھی بٹ رہی ہے
بہت سے قیدی طوق و بیڑی کی کڑیوں کو گن رہے ہیں
غلام زادو! شمار کرنے سے فائدہ کیا؟!
کنویں سے لاشیں نہیں نکالو
شناخت لاشوں کی کس لیے ہے؟
تمام منصف
رئیس زادوں کے اقربا ہیں
تم اپنی بے چارگی سے پوچھو
تمھارے اقربا میں کوئی رئیس ہے کیا؟؟

کجا ہستی

مقتول چاہے افغانستان کا ہو، پارہ چنار کا ، فلسطین کا یا
دنیا کے کسی بھی خطے کا ہوا پنے چاہنے والوں کو تڑپا تا رہتا ہے!!

قلم لکھنے پہ آمادہ ہے
لکھنا چاہ رہا ہے
وہی آنسو
بچھڑنے والے کی جو یاد میں
دریا کی طرح بہہ رہے ہیں
اور بہہ کر آبشارِ وقت میں
جو دھیرے دھیرے ملتے جاتے ہیں
شبِ فرقت مرے سر پر مسلط ہوگئی ہے
سیاہ لمحوں میں ساری روشنائی سوکھ کر

سرخی میں بدلی ہے
قلم لکھنے پہ آمادہ ہے
لیکن!
اسے جو لکھنا ہے وہ کیسے لکھے؟
کلیدِ فکر سے جب قفلِ ابجد کھولنا چاہوں
تو سارے حرف کاغذ پر
لہو کے قطروں کی صورت
سرخ دھبوں کی طرح بس پھیل جاتے ہیں
اور دل موبائل پہ پیغام پڑھتا ہے
''کجا ہستی کجا جانِ پدر رفتی''
گلِ تازہ! صبا فریاد کرتی ہے

نظم

ابداورازل کےنوری تماشے میں
خاکی مجسمے ادھر سے ادھر ڈولتے ہیں
کہاں جائیں؟
اورخاک کوکس طرح سے بچائیں؟

خاک میں خاک مل جائے گی
اورکسی ایک شوریدہ ذرے میں میری تمنائیں
جب رقصِ بسمل کریں گی
تو ممکن ہے پھر
کسی اورکی خاک کامضطرب کوئی ذرہ

تلاشِ سکوں میں
ہواؤں میں اڑتا مرے پاس پہنچے
ابھی وصل کی دوگھڑی بھی نہ گزرے
ہوائیں پیامِ فراق آکے دیدیں
ابداورازل کےتماشے میں
صورت گری خاک کی
اک فریبِ نظر کےسوااورکیاہے؟؟؟

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی

زندگی کی بھیڑ میں ۵رفروری۱۹۶۱ءکوکراچی کے محلّہ پیر کالونی کے ایک چھوٹے سے مکان میں ایک لڑکی نے آنکھ کھولی۔ ماں نے کربِ تخلیق کے مرحلے سے گزرنے کے بعداس بچی کواٹھایاوہ بچی اس تنہاعورت کی رفیق تھی اور باپ کی نورِنظر۔ ماں اس لیےتنہاتھی کہ کربِ ہجرت جھیل رہی تھی اور باپ مشقت کے بوجھ تلے دباہواتھا گویادونوں صرفِ ہجرت ہورہے تھے۔

ہم اُس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جہاں زندگی تہذیب کے دو برزخوں کے درمیان بھٹک رہی تھی۔ پوری ننھیال ددھیال لکھنؤ میں اور ماں باپ کراچی میں۔لکھنؤ اور کراچی میں کتنا فاصلہ سہی مگر میری آنکھوں نے تو اتنا دیکھا کہ ہرخوشی اورغمی کے موقع پرعید،محرم،رمضان وغیرہ میں ماں کی آنکھوں کے دیئے اکثر جل جایا کرتے تھے اِن کی روشنی کراچی میں اور ان کا دھواں لکھنؤ میں۔ جب میں اپنے گھر کی انگنائی میں لگے گلاب، بیلا،گلِ عباس اورعشق پیچاں کے پودوں کو شام کو پانی دیا کرتی تھی تو میری ماں مٹی کی سوندھی خوشبو سے بےچین ہو جاتی اور ہرشام کراچی سےلکھنؤ کا سفر ڈبڈبائی آنکھوں سے طے کرلیتی اور میں ماں کےاس ذہنی سفر سے بے نیاز ایک ایک پودےکو پانی دیتی رہی پھرمیرے باغ کے پودے بدل چکے تھے...

ہماری تربیت کی پہلی اینٹ علم دوستی اور قدرِانسانی پر رکھی گئی۔ خیالات اور رائے کی آزادی ہمیں اس زمانے میں سکھائی گئی جب یہ سب کچھ بغاوت کے مترادف تھا۔علی گڑھ کی تعلیم یافتہ میری ماں اور رئیس امروہوی کی شاگرد نے جب بولنا سکھایا تو کہا ہمیشہ صداقت اورحق کا دامن تھامے رہنا۔کبھی مصلحت اورمنافقت سے کام نہ لینااگراتنی توانائی نہ ہوتو خاموش رہنا۔گرہ میں بندھی یہ نصیحت کبھی ڈھیلی نہ پڑی سب سے پہلے تو معاشرے کے رسم ورواج پرتنقید ہوئی۔ تقلید زدہ معاشرے پرتبصرہ پہلا جرم قرار پایا آزادیٔ فکر نے کہیں کا نہ رکھا۔فکر کی طہارت کے ساتھ گھر سے قدم نکالا اور پہلا قدم ہی بغاوت کے مصداق قرار پایا۔ پیر کی زنجیر کا انتظام کیا گیا۔

(فکر اور ذہن کو محسوس نہ کیا جا سکا) ۵ر دسمبر ۱۹۷۷ء کو فردِ جرم عائد ہوئی۔ سزا جزا میں بدل گئی۔ اختر عابدی صاحب کو سزا اور مجھے جزا!!!۔ ۱۷،۱۶ برس کی عمر میں تو ریاست کے مجرم بھی سزا نہیں پاتے ہیں۔ یہاں جزا کی نوید ملی۔

پنہاں تھا دامِ سخت قریب آشیانے کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

(غالب)

زمانۂ طالب علمی میں طبیعت غزل گوئی کی طرف مائل تھی۔ غالبؔ، مصطفیٰ زیدی اور اداؔ جعفری کے کلام میں کشش محسوس ہوتی تھی۔ مگر یہ سب کچھ چھوڑ کر نئی بستی نئے تقاضے اور نئے رنگ سے سمجھوتہ کر لیا۔ ہاتھوں میں وہ کتابیں نہ تھیں جن میں بچپن گزارا تھا بلکہ دامن میں وہ لعل و گہر تھے ہیرے تھے، جنھیں تراشنا تھا۔ بڑی ذمہ داری تھی مگر تحصیلِ علم کا جذبہ نچلا نہ بیٹھنے دیتا تھا یہ اور بات کہ اس راہ میں دیر سے چلنے کی وجہ سے پاؤں میں چھالے پڑ گئے اور خون تھوکنے کی نوبت آنے لگی خدا بھلا کرے میری ساس کا جنھوں نے حصولِ علم میں مجھے امداد دی۔

زندگی اور اختر عابدی دو قدیم مہربان اور قہربان ہیں۔ یہ ہر موڑ پر ساتھ ساتھ رہے ہیں۔ ہمیں ایک دوسرے سے نبھانے کے سلیقے اور چاہنے کی عادت نے کبھی علیحدہ نہیں ہونے دیا ورنہ نازک موڑ ہماری زندگی میں بھی اکثر آئے لیکن شاید ہم کو ایک دوسرے سے محبت سے زیادہ عادت ہو چکی ہے اور عادت کا بدلنا معجزہ ہے۔

اختر کی سب سے بڑی خوبی اعتماد و اعتبار کی ہے وہ بڑے مضبوط اعصاب کے مالک ہیں مگر میں بڑی ٹوٹی پھوٹی اور شکستہ۔ میں انھیں اپنی ذات کا حِصّہ سمجھتی ہوں کیونکہ دو نصف ایک اکائی ہوتے ہیں اسی لیے اس رفاقت اور سہارے کے باوجود میں تنہا ہوں۔ میرے اردگرد جو دنیا ہے وہ منافقین اور حاسدین کی ہے لوگ مذہب کو فرض کے بجائے فن بنائے شہرت اور نیک نامی کے اصنام کی پرستش میں لگے ہیں میرا صنم کدہ ویران ہے مجھے کسی گروہ یا کسی عبادت گاہ سے کوئی سند نہیں لینی میرے ضمیر کی عدالت اور عبادت گاہ مجھے روز اک اک بُھول اور ایک ایک چُوک پر دار پر کھینچنے کا فیصلہ سناتی ہے۔ اس برزخِ ذات میں حشر کا کوئی امکان نہیں صرف ذات سے دار تلک کا سفر ہے جو ختم ہونے کا نام نہیں لیتا۔ علمِ دین میری فکر کو وسعت عطا کرتا ہے، بجائے اس کے کہ میں

کسی مکتبِ فکر کی پابند ہو جاؤں علم کا شوق مجھے کتابوں میں غرق رکھتا ہے۔ میرے شیلف کی کتابیں میرے ڈرائنگ روم کی زینت میں اضافہ نہیں کرتیں بلکہ مجھے احساسِ جہل میں مبتلا کرتی ہیں Self Education کا شوق دیمک کی طرح میری زندگی کے اوراق کو چاٹ رہا ہے۔ اسی لیے زیور، لباسِ اسناد اور مراتب مجھے مرعوب نہیں کرتے ہر وہ کتاب جو میری فکر کو وسعت دے میری آرائش کا سبب ہے بقول اقبالؔ:

کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ
آزادیِ نسواں کہ زُمرد کا گلوبند!

حق کسی دلیل اور دعوے کا متلاشی نہیں ہوتا۔ اس کے لیے مباحثہ یا مناظرہ بڑا افسردہ رویہ ہے لیکن حق کے اظہار کے لیے الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے ادب میں ابلاغ بہت اہم چیز ہے ہمارے معاشرے کا یہ المیہ ہے کہ شاعری اور عاشقی کو پیشہ سمجھا جانے لگا ہے اسی لیے الفاظ اپنی حرمت کھو رہے ہیں اور شاعر و ادیب اپنا وقار۔

کتابوں کے دفتر ہیں مگر بقول مشفق خواجہ ''جو کتابیں تاریخِ ادب میں جگہ نہیں بناتیں وہ شیلف کے قبرستان میں دفن ہو جاتی ہیں''۔

ادب کی تاریخ بڑی سفاک ہے وہ فنی سقم تو شاید سہوِ نظر کر دے مگر پروپیگنڈے، تعلقاتِ عامہ اور مجمعِ طفلاں کے حوالے سے جو شاعر ادبی حلقوں میں گھس آتے ہیں اُنھیں یکسر نظر انداز کر دیتی ہے۔ ادیب و شاعر کا جغرافیائی حدود اربعہ، تاریخی شجرۂ نسب کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ منصبِ ادب کوئی منصبِ بادشاہت نہیں کہ اس کا ورثہ بدونِ صلاحیت پشت در پشت منتقل ہو جائے اس لیے میں کسی بھی ادبی گروہ سے وابستہ نہیں، سب کے ساتھ ہوں اور سب سے جُدا۔

ادب اور شاعری ہر دور میں اہم فریضہ رہا ہے یہ کارِ پیغمبری ہے۔ لان جائی نس کے بقول ''ارفع ادب کے پیدا کرنے کے لیے عظیم انسانوں کی ضرورت ہے''۔ ایک اچھا شاعر معلّمِ اخلاق بھی ہے اور ماہرِ نفسیات بھی۔ وہ صرف الفاظ کا تانتا نہیں باندھتا بلکہ الفاظ کو پیکر عطا کرتا ہے اسی لیے شفق کی سرخی، چاند کی نرمی، سورج کی گرمی، حد یہ ہے کہ کائنات کی وسعت کو جب سمیٹا جاتا ہے تو اسے شاعری کہتے ہیں۔ کائنات کا خلاصہ ایک اچھے شاعر کا خاصہ ہے۔ اسی لیے آپ بیتی، جگ بیتی بن جاتی ہے اور کلامِ شاعر ترجمانِ کائنات ہو جاتا ہے۔ اعلیٰ سوچ جب ارفع الفاظ و بیان

کا لبادہ اوڑھ لے تو شاعری وجود میں آتی ہے۔

میں ابوظہبی میں گزشتہ بیس برس سے مقیم ہوں۔ ۱۹۷۶ء میں زمانۂ طالب علمی میں افسانے لکھنے کا آغاز کیا۔ کہیں چھپے نہیں شاید اس قابل نہ تھے کہ چھپتے۔ اسی زمانے میں شاعری کا آغاز بھی کیا۔ پھر گھریلو مصروفیات کی وجہ سے قلم کو بند اور کاغذ کو تہہ کر کے رکھ دیا۔ اپنے سسر ہادی عابدی (مرحوم ومغفور) کی تحریک پر پھر لکھنا شروع کیا، بڑے سخن فہم انسان تھے۔ سن ۱۹۸۳ء میں ۷ سال کے تعطل کے بعد جب لکھنا شروع کیا تو نہ تحریر کو اعتبار حاصل تھا نہ قلم کو کوئی خوش فہمی۔

امارات کی ادبی فضاؤں کو قائم رکھنے میں سلیم جعفری جیسے منتظم اور دوست کے ساتھ ساتھ کبیر خان، ظہورالسلام جاوید اور حسن اللہ ہُما جیسے کرم فرماؤں کا بہت ہاتھ ہے۔

''صحرا آنکھیں اور تنہائی'' دراصل زندگی کی تلخیص ہے زندگی کے صحرا میں تمناؤں کا سراب انسان کو شوقِ سفر میں مصروف رکھتا ہے۔ تمنا کا حاصل تشنہ کامی اور تنہائی مسافر کی آخری منزل۔ میں بھی صحرائے زیست میں وحشت زدہ تنہا کھڑی انسانیت کے اجڑنے اور تہذیب کے خیموں کے جلنے پر ماتم کر رہی ہوں۔ جب سفرِ صحرائے زیست کا آغاز میں نے کیا تھا اس وقت یہ سفر قنوطیت سے رجائیت کا تھا مگر نجانے کیسے یہ سفر رجائیت سے قنوطیت کا ہو چکا ہے، سائنسی دور میں انسان انسان سے بچھڑ گیا چاند کا سفر آسان ہو گیا اور قلب ونظر مشکل، میں دنیا کی بھیڑ میں تنہا کھڑی آوازِ استغاثہ بلند کر رہی ہوں کہ کوئی ہے جو انسان سے عقیدت ومحبت اور سائنس کی حقیقت کو ہم آہنگ کر دے کہ وہ وحشت زدہ اور دل گرفتہ انسانیت سکون پائے کوئی آئے اور دل کے سیارے پر کمندیں ڈالے انسان انسان کو فتح کر لے ذہن کی وسعت کے آگے آسمان کی رفعت بھی ماند پڑ جائے، نہیں تو صرف آلات، مشینیں جہاز ہماری احتیاج اور آواز کو کیا سمجھیں گے۔ حرف وصوت کی دنیا ہمارے اندر دم توڑ دے گی اور Internet براعظم کی خبروں کی ترسیل کرنے والے انسان کی درماندگی کی خبر بھی نہ دے پائے گا۔

تسنیم عابدی

....

بکھرے خوابوں کی شاعرہ

آغوشِ مادر کو اوّلین درسگاہ کہا جاتا ہے۔اس عظیم درسگاہ کا فیضانِ تربیت تسنیم عابدی کے حصے میں بھی آیا اور بہت خوب آیا۔

ماں اور وہ بھی ایسی ماں جس نے لکھنؤ اور علی گڑھ کی علمی و ادبی فضاؤں میں تہذیب و ثقافت کے شستہ و شائستہ طور طریقے اپنائے ہوں اور پھر قیامِ پاکستان کے بعد ہجرت کی تکالیف برداشت کرتے ہوئے ان تہذیبی قدروں کو عزیزِ جاں رکھا ہو جو گھٹی میں پڑی تھیں۔

تسنیم عابدی کو شعر و ادب کا ذوق وشوق بنیادی طور پر اپنی والدہ محترمہ سے ملا جو حضرت رئیس امروہوی کی شاگردہ عزیز رہیں۔

اب اس سلسلے میں مزید انکشافات کی ضرورت نہیں۔موزوں طبع ہونا تو ذہنی تربیت میں شامل تھا اس لیے زمانہ طالب علمی میں طبیعت غزل گوئی کی طرف مائل ہوئی اور ابتدائے مشقِ سخن نے غالب، مصطفیٰ زیدی اور ادا جعفری کے کلام میں کشش محسوس کی یہ اور بات ہے کہ شروع شروع میں کچھ افسانے لکھے مگر شعر فہمی اور شعر گوئی کا رجحان غالب رہا اور پچھلے بیس برس کا عرصہ جو اپنے شوہرِ نامدار کے ساتھ ابوظہبی میں بسر ہوا اس عرصے میں یہ شعری تخلیقات مرتب ہوئیں جو ''صحرا آنکھیں اور تنہائی'' میں شاملِ اشاعت ہیں۔

میں تسنیم عابدی کو نہیں جانتا۔جاوید وارثی اور حسن اللہ ہما کو جانتا پہچانتا ہوں۔دونوں خوش فکر شاعر اور میرے دوست ہیں۔جاوید وارثی نے بساطِ ادب کے زیرِ اہتمام دو تین برسوں میں اتنی کتابیں شائع کی ہیں کہ اب ان کے نام گنوانا بھی مشکل ہے۔موصوف نے کئی ماہ پہلے تسنیم کے اس شعری مجموعے کی ایک نقل مجھے یہ کہہ کر دی کہ اس پر کچھ لکھنا ہے۔میں اپنی عدیم الفرصتی کے سبب ایک حرف بھی نہ لکھ سکا۔بھائی جاوید وارثی بار بار تقاضا کرتے رہے پھر ہما صاحب نے بھی

عرب امارات میں بیٹھے ہوئے فون پر بات چیت کی تو زوراسی بات پر تھا کہ جولکھنا ہے جلد از جلد لکھ کر دے دو۔

میری عادت ہے کہ کتاب چاہے شاعری کی ہو یا نثری نگارشات کی جب تک اوّل تا آخر نہ پڑھ لوں تبصرے سے گریز کرتا ہوں۔اس لیے فرصت کے اوقات میں تمام غزلوں اور نظموں کو پڑھا اپنے مطلب کے کچھ اشعار منتخب کیے اور مجموعی لحاظ سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ پچھلی نصف صدی میں اداؔ جعفری پھر زہرا نگاہؔ اور پروین شاکرؔ جیسی شاعرات نے خدا جانے کیا جادو جگایا کہ اب شاعرات کے شعری مجموعوں کی کہکشاں سی سجی ہوئی ہے۔اس کہکشاں کی آب وتاب میں یقیناً ایک قابلِ قدر اضافہ اس کتاب سے بھی ہوگا۔

تسنیمؔ عابدی کی شاعری میں زیادہ وقیع اور متنوع حصّہ غزل کا ہے۔بظاہر غزل گوئی کا فن مشکل نظر نہیں آتا کیونکہ اُردو شاعری کی تاریخ ہر قسم کی غزلوں سے بھری ہوئی ہے اور آج بھی اکثر و بیشتر سخنوروں کی نسلِ نو غزل گوئی کے طلسمات کا شکار رہتی ہے مگر دیکھنا اور سوچنا یہ ہے کہ نئی سے نئی غزلوں کے ذخیرے میں کیا ایسے اشعار بھی مل سکتے ہیں جو آدابِ غزل کی پاسداری کرتے ہوئے ہمارے دل ودماغ میں گھر کر سکیں؟اس سوال کا جواب تسنیمؔ کی غزلیات سے کیا ملتا ہے؟ اس پر مجھے چند اشعار پیش کرنے کی اجازت دیجیے باقی اشعار اپنے اپنے ذوقِ نظر کے مطابق خود تلاش کیجیے تو لطف آئے گا۔

تسنیمؔ کی غزلوں کا مطالعہ کرتے ہوئے جب یہ شعر نظر آیا:

ہونے لگے رخصت تو یہ برگد نے کہا تھا
یہ چھاؤں یہ ٹھنڈک یہ شجر بھول نہ جانا

تو اس شعر کی لفظیات اور معنوی کیفیات نے مجھے ۱۹۴۷ء کا وہ دن یاد دلا دیا جب اپنے گاؤں کے گھنے بوڑھے برگد کو الوداع کہتے ہوئے آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔تسنیمؔ نے برگد کو مشخّص کر کے اس استعارے سے عہدِ ماضی کا ایسا جہانِ معنی اجاگر کیا ہے۔جس کی اہمیت وافادیت پر آج کے مادی آسائشوں اور آلائشوں کے شیدائیوں کو غور کرنا چاہیے۔چھاؤں،ٹھنڈک اور شجر کیا تھے اور اب کہاں ہیں یہ علامتیں اور یہ اشارے کچھ کم معنی خیز نہیں:

باہمہ ذوقِ آگہی ہائے رے پستیٔ بشر
سارے جہاں کا جائزہ اپنے جہاں سے بےخبر
(جگر)

تسنیم کا ایک اور شدید تاثراتی شعر پڑھیے:

کچھ چاندنی اداس تھی کچھ دل بھی تھا اداس
کل رات کربِ ذات بھی حد سے سوا ہوا

دراصل اس کتاب کی بیشتر شعری تخلیقات کربِ ذات اور کربِ کائنات کا استعارہ ہیں۔ آپ چاہیں تو اس میں کربِ مہاجرت اور کئی دوسری کرب ناکیوں کو شامل کر سکتے ہیں۔

ایک اچھے اور سچے شعر کی تاثریت محدود نہیں ہوتی بلکہ ماورائے سخن بھی بہت سی باتیں حساس دلوں کی محسوسات میں دھیمی دھمی چبھن پیدا کرتی رہتی ہیں۔

تسنیم کی غزلوں میں زندگی اور ماحول کے داخلی و خارجی عوامل اور مظاہرِ فطرت سے ان کا اشتراک، وجدانی سطح پر عجیب عجیب سوال اٹھاتا ہے۔ مثلاً:

ہرے درختوں کی رنگت اُڑی اُڑی کیوں ہے
یہ شمعِ عشق نہ جانے بُجھی بُجھی کیوں ہے
سنہرے خواب بُنے تھے مرے خیالوں نے
اب آنکھ میں مری ہر دم نمی نمی کیوں ہے

شب کو چوکھٹ پر دیا روز جلا کر سوچوں
راہ تکنے کی بھی ہوتی ہے یہ عادت کیسی
اس کی محفل سے جو لوٹے تو یہ محسوس ہوا
ایک مرکز پہ سمٹ آئی ہے وسعت کیسی

اب امن کا پیغام بھلا کون سنائے
اک فاختہ زخمی یہاں رستے میں پڑی ہے

جدید غزل کے سفر میں تسنیم عابدی کی شعریات کو کسی عنوان نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ

جدید لہجے اور لفظیات کی ہمسفر ہی نہیں دور دیس میں زبان و ادب اور ہماری تہذیب و ثقافت کی سفیر بھی ہیں لیکن افسوس کہ وہ گھر، وہ وطنِ عزیز جس کے لیے بڑے سنہرے اور سدا سہانے خواب دیکھے تھے اس گھر کے رکھوالوں نے امن و آشتی اور حقیقی ترقی و خوشحالی کی بجائے ہمیں قتل و غارت گری اور لوٹ کھسوٹ کی روح فرسا اذیتوں سے دوچار کر دیا یہ اذیت ناکی تسنیم کی غزلوں میں بھی بڑی شدت سے نمایاں ہے:

بے حسی کا رنگ ہر دیوار و در پہ چڑھ گیا
خون کے آنسو بھی اب تو بے اثر ہونے لگے
لوٹ جانے کی تمنا دل ہی دل میں رہ گئی
راستے خود اپنے گھر کے پُر خطر ہونے لگے

اقوامِ متحدہ کے منشور اور نام نہاد مہذب دنیا کے اتنے سمٹ جانے کے باوصف عالمِ انسانیت ظلم و ستم کی جس آگ میں جل رہا ہے اس کے عبرت ناک مناظر ہم سے پوشیدہ نہیں۔ حدیثِ دیگراں کا کیا ذکر ہم اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھیں تو منافقت، ریا کاری، سطحی مفاد پرستی، اندھی خویش پروری اور بہت سے اخلاقی جرائم ہمارے سینوں میں پل رہے ہیں۔

تسنیم کی غزلوں میں لفظی و معنوی صنعتوں کے ساتھ ہمیں ایسے تیکھے اشعار بھی خاصی تعداد میں مل جاتے ہیں جن میں سانحہ کربلا کی تلمیحاتی بازگشت سی سنائی دیتی ہے مثلاً:

یہ حسنِ امتحان تھا پیاسے کے واسطے
دریا پہ لا کے سر کو قلم کر دیا گیا

کمک نہ آئے گی تم انتظار مت کرنا
یہ اہلِ کوفہ ہیں کچھ اعتبار مت کرنا

غزلیات سے قطع نظر تسنیم کی آزاد نظمیں بھی خاصی جان دار ہیں اور نظمِ آزاد کے ساتھ ساتھ مقفیٰ نظمیں یہ ثابت کرتی ہیں کہ مسئلہ ہیئت Form کا نہیں بلکہ شاعرہ کے اپنے حسیاتی و فکری اظہار کا ہے۔ قلبی واردات، شخصی تجربات، ذاتی مشاہدات، اور ادبیات کے وسیع مطالعے سے جو کچھ حاصل ہوتا رہا اسے حسبِ دلخواہ شعری پیکروں میں ڈھال دیا، مثال کے طور پر آزاد نظموں

کے عنوانات میں خواہشوں کی تتلیاں، بکھرے خواب، گردِ سفر، قدرِ مشترک، انا کی آگ اور کئی دوسرے عنوان نظر آتے ہیں جن پر بہت ہی سلیقے سے نفسِ مضموں کو فنی گرفت میں رکھا گیا ہے۔

کتاب آپ کے سامنے ہے معلوم نہیں آپ ان نظموں کو پڑھ کر کیا کچھ محسوس کرتے ہیں ہاں مجھے ذاتی طور پر تسنیم کی نظمیں اس لیے بڑی اچھی لگیں کہ ان میں رجائیت اور جمال آفرینی کے پہلو خاصے پرکشش ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ اس پہلے شعری مجموعے کی مقبولیت اور پذیرائی کے بعد جب دوسرا شعری مجموعہ منظرِ عام پر آئے تو اس میں نظموں کا حصّہ زیادہ ہو۔ میرا خیال ہے کہ غزل کے اشعار میں خواہشوں کی تتلیاں موضوعاتی اعتبار سے پھول پھول پر منڈلا سکتی ہیں مگر اچھی نظم نگاری کے لیے دل و دماغ کا جماؤ اور پڑاؤ کسی ایک منزل پر ایسا ٹھہراؤ چاہتا ہے جو قدرے جم کر کسی بھی پسندیدہ موضوع کے تانے بانے اور فکری و فنی لوازمات اپنے تصرف میں رکھے۔ بہر کیف تسنیم عابدی کی شاعری کا یہ نقشِ اوّل بہت سی خوبیاں رکھتا ہے۔ علم و فن میں کاملیت کی کوئی منزل ہے بھی یا نہیں اس بحث میں الجھنا بے سود ہے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش میں یہی بات سچی ہے جو تسنیم نے کہی ہے:

خود دھواں بن کے میں سب کو روشنی دیتی رہی
کچھ سنہرے خواب آنکھوں میں نکھر کر رہ گئے
تتلیوں کے رنگ ہاتھوں میں اتر کر رہ گئے

پروفیسر آفاق صدیقی
صدر شعبہ اُردو، پروگریسو ڈگری کالج - کراچی

....

چند تاثرات

اُردو شاعری اس اعتبار سے قابلِ توجہ ہے کہ اس کا دامن لمحاتِ گزراں کے ساتھ ساتھ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ تجربے، مشاہدے، اور محسوسات کی وہ دنیا جو کسی محدود، ماحول کا حِصّہ ہوتی تھی اب جغرافیائی حدود کو توڑ کر عالمی سطح تک پہنچ چکی ہے۔ انسان بہر حال تغیر اور تبدیلی سے متاثر ہوتا ہے اور اس کی سوچ کے سانچے زندگی کے تقاضوں کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔ اس صورتِ حال کے بھی کئی زاویے ہیں۔ ان میں سے ایک اہم زاویہ ہمارے معاشرے کی خواتین کا جذبۂ عمل ہے جو بڑی تیزی سے خود کو اس طرح منوا رہا ہے کہ ماضی میں جو کچھ حق تلفی ہوئی ہے اس کی تلافی ہو سکے۔ یہ ایک بہت خوش آئند بات ہے۔ انسانی معاشرے کے ایک بہت بڑے حصے کو براہِ راست اپنی بات اپنے انداز میں کہنے کا موقع مل رہا ہے۔ اور اظہار کا پیرایہ اور سلیقہ اہلِ قلم خواتین خود ہی اپنے مزاج کے مطابق اختیار کر رہی ہیں۔

تسنیم عابدی بھی آج کے شعری سفر میں اسی انفرادیت کے ساتھ شامل ہیں۔ وہ ایک تعلیم یافتہ حساس اور دردمند خاتون ہیں۔ ان سے شاعری کی بعض محفلوں میں کلام سننے کا اتفاق ہوا۔ پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ وطن سے دور ایسے ماحول میں ہیں جہاں تجربوں کے نئے موسم ان کے دامنِ تخلیق کو چُھوتے رہتے ہیں۔ اب ''صحرا آنکھیں اور تنہائی'' کے نام سے تسنیم کا پہلا شعری مجموعہ شائع ہو رہا ہے تو اندازہ ہوا کہ ان کا سرمایۂ سخن تو خاصا ہے۔

عرب امارات میں رہتے ہوئے صحراؤں اور نخلستانوں کا اثر قبول نہ کرنا ممکن نہیں۔ اس فضا کو تسنیم عابدی نے اپنے شعری مجموعے کے نام ہی میں اسیر کر لیا ہے۔ پھر وہ تعلق جو انھیں اپنے وطن اور وہاں کے تخلیقی محرکات سے ہے وہ بھی اس مجموعے کا اہم حِصّہ ہے۔ تسنیم عابدی کی غزلوں اور نظموں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں شعری اظہار کا ایک طوفان چھپا ہوا ہے جو

مسلسل الفاظ کے پیکروں میں ڈھلنے کے لیے بے تاب رہتا ہے۔ اسی لیے ان کے کلام میں بے ساختگی نمایاں ہے اور یہی تند بہاؤ کہیں کہیں انھیں فنی معاملات سے بھی بیگانہ کر دیتا ہے اور پڑھنے والا سوچتا ہے کہ تکمیلِ سخن کے سارے لوازم یکجا ہو سکتے تو اور اچھا تھا۔

تسنیم عابدی زندگی میں خلوص، محبت اور صداقت کی قائل ہیں۔ وہ انفرادی اور اجتماعی طرزِ حیات میں انہی اقدار کو برتتی ہیں اور دوسروں سے بھی اس کی توقع رکھتی ہیں۔ لیکن اس بارے میں دو رائے نہیں ہو سکتیں کہ شاعر کے حساس دل اور باشعور ذہن میں جو گلشنِ ناآفریدہ آباد ہوتا ہے اس کی نشانیاں خارج کی دنیا میں یا تو مفقود ہوتی ہیں یا بہت کم دکھائی دیتی ہیں۔ اسی لیے شاعر اپنے اشعار میں اس پوری کشمکش کو منتقل کر دیتا ہے جو اس کے وجود کے ناگزیر جزو کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس پس منظر میں تسنیم عابدی کی غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

آنکھ زخمی ہے مرے خواب ہیں بکھرے بکھرے
کس قدر سوچتے رہنے کی سزا پائی ہے

میں نے تقویمِ تمنا کو پڑھا تھا جس گھڑی
کس قدر تھی زندگی سے بدگماں مت پوچھیے

سب چلے جائیں گے اک بے نام منزل کی طرف
گھر کی تختی کی جگہ کتبے لگے رہ جائیں گے

یہ کس نے فکر و فہم کو محبوس کر دیا
اس قید میں ہے ذہن فقط جسم و جاں نہیں

شریکِ بزم کوئی بے ادب بھی رہنے دو
یہ امتیاز تو باقی رہے، ادب کیا ہے

مرنے پہ لوگ جشن مناتے ہیں کس لیے
خوں بہنے پر جو ہوتی تھی وحشت کہاں گئی

مقتول تو نیزے پہ بھی آسودۂ جاں تھا
قاتل کو مگر کتنا پریشان سا دیکھا

لکھ رہی ہوں میں رفاقت کی سنہری یادیں
میرے مضمون کے عنوان کو جانے دیجیے

اس طرح کے اشعار کی نوعیت بتا دیتی ہے کہ تسنیم عابدی کا پیرایۂ سخن کیا ہے۔ ان کی غزلوں اور نظموں میں گرد و پیش کی زندگی کا عکس ہے۔ مجموعی طور پر وہ حوصلہ مند ہیں اور ان زخم انگیز حالات میں بھی انھیں یقین ہے کہ کوئی عہدِ مرہم بدست آئے گا۔ وہ بہتر انسانی مستقبل پر یقین رکھتی ہیں اور یہی آج کی شاعری کا مناسب جواز ہوسکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تسنیم عابدی کا یہ شعری سفر جاری رہے گا۔

پروفیسر سحر انصاری

چیئرمین اُردو ڈکشنری بورڈ کراچی

....

تسنیم عابدی کی شاعری

زن اور زمین تخلیق کا سرچشمہ ہیں۔ عورت ماں ہے اسی لیے دھرتی کو بھی ماں کہا جاتا ہے۔ افزائشِ نسل سے فصل اگانے اور فصل اگانے سے تہذیبی اقدار کی نمو اور فنونِ لطیفہ کی ترویج و ترقی تک عورت نے ہر شعبے میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ غالباً مردوں سے بھی زیادہ لیکن مادری نظام کے پدری نظام میں تبدیل ہو جانے کے باعث عورت کے کردار کو اُس طرح تسلیم نہیں کیا گیا جس طرح کہ اسے تسلیم کیا جانا چاہیے تھا۔ جسمانی طاقت و وسائل پر تصرف اور اقتدار پر قبضے کی بِنا پر مرد نے ہر چیز اپنے نام کر لی۔

جہاں تک شاعری کا تعلق ہے اس صنف میں بھی خواتین نے ساری دنیا میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ اُردو میں بھی خواتین کی شاعری کی روایت بہت پرانی ہے لیکن اُردو شاعری کی ترویج چونکہ مشاعرے کی مرہونِ منت رہی اور خواتین پردے کے سخت انتظام کے باعث مشاعرے میں حِصّہ نہیں لے سکتی تھیں اس لیے خواتین کی خاطر خواہ حوصلہ افزائی نہ ہوسکی۔ اور نہ اِن کی کارگزاری کو لائقِ اعتنا سمجھا گیا۔

قیامِ پاکستان کے بعد جن شعبوں میں واقعتاً نمایاں ترقی ہوئی ان میں خواتین کی شاعری کو ایک امتیازی درجہ حاصل ہے۔ اُردو شاعری کے آغاز سے برصغیر کی آزادی تک شاعرات کی اتنی تعداد اور ان کے کلام کا وہ معیار نظر نہیں آتا جو قیامِ پاکستان کے بعد گزشتہ پچاس سال میں واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان بننے کے بعد خواتین میں تعلیم کا رواج عام ہوا اور انھیں زیادہ آزادی میسر آئی۔ تعلیم اور آزادی نے خواتین کی شاعری کو دیکھتے دیکھتے کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ اداؔ جعفری سے فوقیہؔ مشتاق تک شاعرات کی

ایک طویل قطار ہے جس نے نہ صرف یہ کہ اچھی شاعری کے نمونے پیش کیے بلکہ اُردو شاعری کے مزاج کو بھی متاثر کیا اور اس میں نئی جہتوں کا اضافہ بھی کیا۔ اب یہ اور بات ہے کہ بعض خواتین انتہا پسندی کا شکار ہو گئیں۔ انھوں نے مردوں کی طرف سے کی جانے والی زیادتیوں اور ناروا سلوک کی صرف شکایت نہیں کی بلکہ انھیں اپنے ازلی دشمن اور بعض صورتوں میں ایک الگ ناپسندیدہ مخلوق کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی۔ اس پورے منظر نامے میں اعتدال کا دامن ان کے ہاتھوں سے دامانِ خیالِ یار کے مانند چھوٹتا نظر آتا ہے۔

جن خواتین نے اپنی نسائیت کو تماشا بنانے کے بجائے اپنی حدود اور دائرہ کار میں رہتے ہوئے شاعری کی ہے ان میں ایک نام تسنیم عابدی کا بھی ہے۔ اس بات کا احساس شاید لاشعوری طور پر خود تسنیم عابدی کو بھی ہے۔ اسی لیے انھوں نے ایک اور زاویے سے ہی کہا ہے کہ:

ہوئے برباد سجدے ایک حرفِ لا کے کہنے سے
بغاوت ساتھ ہو تو پھر اطاعت ہو نہیں سکتی

یہ بات نہیں کہ انھیں صنفِ مخالف سے شکایت نہیں ہے۔ وہ حرفِ شکایت زبان پر ضرور لاتی ہیں مگر دھیمے اور شائستہ انداز میں:

جنبشِ لب کی ہم کو سزا مل گئی
سارے سجدے گئے آستانے گئے

وہ عورت کے صنفی تقاضوں اور اس کے حسنِ پاکیزگی سے اچھی طرح آگاہ ہیں:

آنچل کو میرے سر سے اڑانے کی جستجو
اے موجۂ ہوا یہ شرارت نہیں کرو

عہدِ حاضر کی شاعری میں انا کا ذکر مختلف زاویوں سے بہت کثرت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ یہ انا خودی اور عزتِ نفس سے الگ چیز ہے اور بیشتر صورتوں میں شخصیت کے کمزور اور منفی پہلو کی طرف اشارہ کرتی ہے اسی لیے یہ دو محبت کرنے والوں کے درمیان دیوار کی طرح حائل ہو جاتی ہے۔ تسنیم عابدی نے بھی انا کے موضوع پر اشعار کہے ہیں۔ مثلاً:

کیا کہیے بس انا کی بدولت ہی چپ رہے
ورنہ وہ جا رہا تھا تو دل کو ملال تھا

یا پھر یہ کہ...

تصفیہ مابین اپنے ہو نہ پائے گا کبھی
ہم انا کی آگ میں جلتے ہوئے رہ جائیں گے

عصرِ حاضر کے ادب میں ہجرت کا موضوع بھی ایک اہم موضوع ہے۔ مغرب میں بھی اس کے حوالے سے خاصا ادب تخلیق کیا گیا ہے۔ برصغیر میں قیامِ پاکستان کے بعد ہندوستان کے مختلف علاقوں سے نئے وطن کی طرف مسلمانوں کی ہجرت نے اُردو شعر و ادب میں اپنے لیے جگہ بنائی۔ اس کے بعد پاکستان سے دیگر ممالک کی طرف ہجرت نے بھی کچھ نئے موضوعات اور نئے مسائل سے ادب کو آشنا کیا۔

تسنیم عابدی کا تعلق آبائی طور پر شہرِ نگاراں لکھنؤ سے ہے لیکن وہاں سے کراچی کو ہجرت ان کے تجربے کا نہیں بلکہ ان کے والدین کے تجربے کا حِصّہ ہے۔ ہجرت کا تجربہ تسنیم عابدی کو اس وقت حاصل ہوا جب انھوں نے کراچی سے نکل کر متحدہ عرب امارات میں سکونت اختیار کی۔ اس تجربے کو انھوں نے کس طرح پیش کیا ہے مندرجہ ذیل اشعار میں ملاحظہ فرمائیے:

دی خانہ بدوشی نے مجھے کہہ کے تسلی
ہے زیست کا مقصد ہی سفر، بھول نہ جانا

شہر کو چھوڑ کے صحرا کی طرف ہجرت کی
وحشتِ دل کو بہر طور نبھائے رکھا

دشتِ غربت کی مسافت تھی مقدر ورنہ
اپنے بھی گرد بہت حلقۂ یاراں ہوتے

اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ تسنیم عابدی کی شاعری بس اِنھیں موضوعات تک محدود ہے۔ وہ اپنے شہر اور اپنے ماحول کے دیگر سیاسی و سماجی مسائل پر بھی نظر رکھتی ہیں اور انھیں اپنی شاعری میں پیش کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں چند شعر دیکھتے چلیے:

نہ ہوگا فرق قول و فعل میں ہم کو پرکھ لینا
کبھی بھی سادہ لوگوں سے سیاست ہو نہیں سکتی

بو کے فتنوں کو مرے شہر میں وہ پوچھتا ہے
کوئی بتلائے کہ ہوتی ہے یہ شورش کیسی
انقلاب آئے نہ لوگوں کو کوئی حق ہی ملے
یہ مرے شہر میں ہوتی ہے بغاوت کیسی

تسنیم عابدی غزلیں بھی کہتی ہیں اور نظمیں بھی اور اپنی فطری صلاحیت اور مشق کی بنا پر انھوں نے کہنے کا ہنر بڑی حد تک سیکھ لیا ہے۔ کہنے کے اس ہنر کو مزید مستحکم کرنے کے بعد انھیں ان کہی کے ہنر سے بھی آشنائی حاصل کرنی ہے کہ اچھا بامعنی اور پائیدار ادب کہی اور اَن کہی کے امتزاج سے ہی جنم لیتا ہے۔

علی حیدر ملک

....

ایک کی تلاش

محبت فرض ہے...محبت قرض بھی ہے۔ اگر بروقت ادا ہوتو فرض ورنہ قرض! آج جب اس قرض کی ادائیگی کرنے لگی ہوں تو میرے کیسۂ افکار میں پڑے الفاظ اپنی کم وقعتی پر نادم ہیں۔ میں اپنی تاخیر پر شرمندہ ہوں کیونکہ جانے والا جا چکا ہے جسے نہ دعائیں نہ دوائیں اور نہ آہیں روک سکیں۔

خواصِ ادب تو ڈاکٹر وراثت شکُوہ کشمیری کے نام سے خوب واقف ہیں کہ وہ سخن فہم اور سخنور تھے مگر شاید عام قاری کے لیے ان کا نام جانا پہچانا نہ ہو کہ ان کا میدانِ عمل سائنسی تحقیق تھا۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے حیاتیاتی کیمیا میں اعلیٰ ڈگری حاصل کرنے کے بعد وہ گزشتہ چالیس برس سے امریکا کی مختلف یونیورسٹیوں سے منسلک رہے نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ہیلتھ میں کینسر ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے اپنا لوہا منوایا اور آخرش اسی عارضے میں گزشتہ سال اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر کے فنافی الفرض کے درجے پر فائز ہوئے۔

ہمیں یہ افتخار حاصل ہے کہ ہماری پرورش میں اماں بابا کے ساتھ اس نابغۂ روزگار...جو ہمارے وراثت ماموں تھے... کے خطوط اور ان کی صحبتِ غیر مترقبہ کا بھی قابلِ ذکر حصّہ ہے۔ امریکا آج جتنا قریب آچکا ہے کل ذرائع ابلاغ کی نایابی کی وجہ سے اتنا قریب نہ تھا بلکہ ہمیں اُس وقت وہ چاند سے بھی زیادہ دور لگتا کیونکہ زمین سے کم از کم چاند دیکھا تو جا سکتا تھا مگر امریکا میں مقیم لوگوں سے آج کی طرح رابطے کا کوئی تصور نہ تھا۔ اس کے باوجود وراثت ماموں ہمارے قریب تھے کیونکہ وہ باقاعدگی سے خطوط کے ذریعے ہم سے رابطہ رکھتے۔ وہ ہر تین چار سال بعد آتے ہماری فکر کو جِلا عطا کر کے ہماری خوابیدہ روح کو بیدار کرتے، ہمیں نئے نئے سوالات دے کر غور وفکر پر مہمیز لگا جاتے۔ اپنی تہذیب کا یہ نمائندہ شخص یوں آتا کہ لگتا جیسے امریکا سے نہیں لکھنؤ

سے آیا ہو... وہ مغربی فکر اور مشرقی تہذیب کا پُر وقار امتزاج تھے اور اس کے پر چارک بھی۔ سادگی، مروت، مؤدت اوراخلاص کا یہ پیکر خاندان بھر کے لیےشجرِ سایہ دار تھا۔اب ہرطرف وقت کی کڑی دھوپ ہےاوراحساسِ محرومی۔

اس کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں چند شکریے جو مجھ پر واجب ہیں حسبِ سابق اور حسبِ روایت اپنے ناشر نقوش نقوی، انتہائی پُر خلوص مشیر حسن اللہ ہماؔ اور میرے رفیقِ کار محترم ظہیر بدر کا جن کی میں احسان مند ہوں کہ جنھوں نے میرے کام کو آسان کیا۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر عبدالکریم خالد، ڈاکٹر شبیہ الحسن ہاشمی اور ڈاکٹر سید نوازحسن زیدی کی جنھوں نے اپنی قیمتی آرا سے کتاب کو زینت بخشی۔

قارئینِ کرام! عہدِ جدید پریشاں فکری اور حیراں نظری کا دور ہے کہ انسان لفظوں کے بجائے ہندسوں پر اعتبار کرنے لگا ہے۔''تماشا'' کی پیشکش دریں حالات سراسر خسارے کا سودا ہے مگر دوسری طرف یہ لفظ کو ہندسے سے جوڑنے کی ایک سعیٔ پیہم کا حِصّہ ہے۔ آج کے دور کا مسئلہ صرف اسی صورت میں حل ہوسکتا ہے کہ روح اور جسم کا ٹوٹا ہوا رشتہ بحال ہو۔ ہندسوں کو قابلِ اعتبار سمجھنے والے جمع اور تفریق کے کھیل میں سرگرمِ عمل رہتے ہیں اور جب اپنے دامنِ زیست کا جائزہ لیتے ہیں تو جو ہندسہ باقی بچتا ہے وہ صفر ہوتا ہے صفر غیر معتبر اور بے وقار، جو ہر گھڑی ایک کو شکست دینے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں پھر اپنی بقا کی خاطر مجبوراً اور مصلحتاً اسی ایک کے پیچھے چل دیتے ہیں جدھر نظر دوڑائیں ۔صفر کا اژدہام ہے صفر تقلید، شکست اور خسارے کی علامت ہے۔اس صفر زدہ ماحول میں مجھے ایک کی تلاش رہتی ہے جو سر بہ فلک رہتا ہے۔قارئین! میں اس تلاش میں کتنی کامیاب ہوئی اس کا فیصلہ آپ کے ہاتھ ہے۔

تسنیمؔ عابدی

۲۱رمئی دوہزار چھ

....

ایک خود شناس شاعرہ... تسنیم عابدی

تسنیم عابدی صاحبہ کراچی کی باسی اور میں ٹھہرا لاہوریا۔صورت نا آشنا اور تعارف سے محروم نقاد جب کسی تخلیق کار کے بارے میں لکھے تو یہ دِقت ہوتی ہے کہ تعلق نہ ہونے کی وجہ سے شخصیت کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی جاسکتی یعنی کچھ کلیشے، کچھ دلچسپ واقعات، کچھ لطیفے اور کچھ چٹکلے بیان کر دیئے اور لیجیے مقالہ حاضر! تقریباتی شخصیت کے مقالات اس انداز واسلوب کی بہت اچھی مثالیں ہیں مگر مجھے یہ سہولت حاصل نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ برادرم شبیہ الحسن کے حکم کی تعمیل میں یہ چند سطریں قلم بند کر رہا ہوں:

قالبِ شعر میں ہر غم کو سمونا ہے تو پھر
شعر کو قافیہ پیمائی نہ سمجھا جائے

''تماشا'' کی خالق تسنیم عابدی کے اس شعر کے ساتھ اس کی نظم ''کسبِ سخن'' کا اختتامی مصرعہ ملا لیں:

میں کشفِ ذات سے کسبِ سخن کماتی ہوں

تو شاعرہ کے فنی آدرش کو سمجھنا دشوار نہیں رہتا۔

محترمہ تسنیم عابدی کا تعلق کراچی سے ہے وہ کراچی جو شعر و نقد میں جداگانہ تشخص کا حامل ہے اور جس نے دنیائے شعر کو پروین شاکر جیسی شاعرہ دی (تسنیم عابدی بھی جس کی مداح ہیں ملاحظہ ہو نظم ''شاعری کا ماہِ تمام'')

وہ جو صبا مثال تھی جانے کدھر گئی
''خوشبو'' کو عام کر کے جہاں سے گزر گئی
احساس کا دریچہ سجایا تھا اس طرح
''صد برگ'' اس کے کرب کا اظہار کر گئی

سودا تھا نقدِ حرف کا بازارِ زیست میں
اہلِ سخن کے واسطے ''انکار'' کر گئی

فکری سفر شعور کا جادہ لیے ہوئے
وہ ''خود کلامی'' کرتے ہوئے کام کر گئی

وہ چاندنی کا نرم سا لہجہ لیے ہوئے
''ماہِ تمام'' کی طرح دل میں اُتر گئی

اُردو ادب میں نام فروزاں رہے ترا
خود بجھ گئی چراغ سرِ راہ دھر گئی

نقاد اور شاعر میں تعلق، دوستی، کبیدگی یا دشمنی نہ ہو تو قلم پسند، ناپسند کی روشنائی میں ڈبو کر نہیں لکھا جاتا، شخصیت منفی ہو جائے تو تعلق صرف کلام سے رہ جاتا ہے، اگر کلام منہ سے بولتا ہو تو لکھنے میں سہولت رہتی ہے کلام گونگا ہو اور نقاد سے کلام نہ کرے تو لکھنا دشوار ہو جاتا ہے مگر مجھے کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑا کہ تسنیم عابدی شعر کے پیرایہ میں ایک موضوع کی خود کلامی کرتے ہوئے دل اور دردِ دل کا ماجرا کہتی ہے، ان چند مثالوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ تسنیم کا روئے سخن دنیا والوں سے کم اور خود سے زیادہ ہے:

عمر رشتوں کے تقاضے ہی نبھاتے گزری
زندگی نے مجھے اپنا کبھی ہونے نہ دیا

حیرتیں آنکھ میں دل میں غمِ جاں رکھنا ہے
ہم کو معلوم ہے کس شے کو کہاں رکھنا ہے

اس کی باتوں میں اب کہاں جادو
مجھ میں بھی کوئی دلکشی نہ رہی

خوش شناسی کے طلسمات سے تو بہتر تھا
مجھ کو پریوں کے شبستان میں رہنے دیتے

زندگی نام ہی جس شخص کے ہم کر بیٹھے
اب وہی ترکِ تعلق کی دعا مانگے ہے

اسے میں اس کی طرح سے جواب دے نہ سکی
مرے مزاج سے شائستگی نہیں جاتی

سارے عالم میں انتخاب کیا
میری مٹی کو پھر خراب کیا

صحرا ، شام کا سناٹا اور تنہائی
سورج ڈوبتا جب ، میں اپنے گھر جاتی

اسی انداز اور اسلوب کے اشعار کی کمی نہیں ۔غزلیں پڑھتے جائیے اور اشعار سے لطف کشید کرتے جائیے۔

تسنیم عابدی اس لحاظ سے خوش قسمت ہے کہ ماضی کی شاعرات کے برعکس وہ اپنی نسوانیت کا کھل کر اظہار کرسکتی ہے، ماضی کی شاعرہ، اپنی بات، مردانہ اسلوب میں کہتی تھی، معاملہ نسوانی اشعار مردانہ، اس وقت تو شعر اور مضحکہ خیز ہو جاتا تھا جب عورت مرد بن کر مردانہ اسلوب میں عشق، ہجر اور وصل کے مضامین باندھتی لیکن اب اظہارِ ذات کے لیے شاعرات پر کوئی پابندی نہیں ۔ وہ جس ملک میں چاہے، جس اسلوب میں چاہے اور جس پیرایہ میں چاہے اپنے بارے میں لکھ سکتی ہے اور اس سے آج کی شاعرہ پر بلحاظِ تخلیق کار بھاری ذمہ داری بھی عائد ہو جاتی ہے۔ اب اسے عورت ہونے کی بناپر رعایتی نمبر دے کر ''پاس''نہیں کیا جا سکتا اب اسے معاصر شعرا سے اپنی تخلیقی صلاحیتوں پر مقابلہ کرنا ہے۔

تنقید نے عورت کو اس کی شاعری سمیت تسلیم کر لیا ہے لہٰذا اب آنچل کے پیچھے مونچھ دیکھنے والا مردانہ رویہ بھی متروک قرار پا رہا ہے۔ تسنیم عابدی کے یہ اشعار اس کے ہونے کی دلیل ہیں

:مٹھی بھر خاک اور اک کتبہ
زندگی بھر کا یہ خلاصہ ہے

اک لباس اور وہ بھی سادہ سا
آخری پیرہن پہ غور کیا

دل کا یقین آنکھ کی حیرت نہیں گئی
پیغمبری تو مل گئی لکنت نہیں گئی

تماشے میں پسِ پردہ سبھی کردار بے بس تھے
سحر کاری تھی ساری، ہم اداکاری نہ کرتے تھے

وہی ہے چاک پر گردش میں عنصر
ہنر میں دستِ کوزہ گر نہیں ہے

سر جو نیزوں پہ فروزاں ہیں وہ ہیں ساتھ مرے
میری تنہائی کو تنہائی نہ سمجھا جائے

جھیل میں بس ایک کنکر پھینک کر
دائرے کی گونج میں سنتی رہی

غزلوں، نظموں اور قطعات پر مشتمل ''تماشا''، تسنیم عابدی کا تیسرا شعری مجموعہ اپنے دامن میں سوچ کے متعدد کنائے لیے ہوئے ہے۔ ''تماشا'' شاعرہ کی ذات کا جزیرہ سہی لیکن وہ خود کو اس جزیرے تک محدود نہیں رکھتی، خوش ذوق قارئین کو بھی دعوتِ فکر دیتی ہے۔ تسنیم سے ''صحرا آنکھیں اور تنہائی''، ''بصیرت کے چراغ'' اور ''تماشا'' کے بعد ''تماشا'' مکرر کی توقع بے جا نہ ہوگی۔

ڈاکٹر سلیم اختر

....

تسنیم عابدی کی شاعری کے رنگ

شاعری محض تہذیبِ نفس اور ترفیعِ جذبات کا فریضہ ہی انجام نہیں دیتی بلکہ زندگی کو ایک خاص ڈھب پر لا کر اس میں ترتیب اور تنظیم پیدا کرتی ہے۔ بظاہر یہ عمل میکانکی نوعیت کا لگتا ہے مگر شاعر کا مایۂ خیال اتنی صفائی اور باریک بینی سے یہ کام سرانجام دیتا ہے اور اس قدر غیر محسوس طریقے سے شعور اور لاشعور کی حدِ فاصل معدوم کر کے دونوں کیفیتوں کو باہم آمیخت کرتا ہے کہ قاری اپنی ذہانت کے باوجود ان کی حدوں کا تعین نہیں کر پاتا۔ شاعر کا یہی سلیقہ الفاظ کے چناؤ، ان کی درجہ بندی، معانی کی تغیر پذیری اور خیال سے ان کی والہانہ وابستگی کے بھی کام آتا ہے۔ اور یوں باطنی اور خارجی سطح پر اُس کی تخلیقی اُپج ایسے ایسے نئے نقشے، نرالی صورتیں ایجاد کرتی ہے کہ وہ خود بھی ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتا ہے اور ایک مدت تک ان کے سحر سے آزاد نہیں ہو پاتا۔

میرے خیال میں تسنیم عابدی کا شمار بھی ایسے ہی تخلیق کاروں میں ہوتا ہے جن کے یہاں شاعرانہ فن ایک خاص نوع کے سلیقے کا رہینِ احسان ہے۔ یہ ان کی نسائیت کا کمال بھی ہوسکتا ہے کہ صنفِ نازک کے ہاں سلیقے کا حسن باریک اور نازک سطحوں پر نمایاں ہوتا ہے جسے مشاہدہ کرنے کے لیے بصارت سے زیادہ بصیرت سے کام لینا پڑتا ہے۔ ان کی شاعری میں بہت سے رنگ مل جل کر تجسیم ہوتے اور بقول ان کے ایک شہرِ سخن آباد کرتے ہیں۔ ان رنگوں میں یادوں کی قوس وقزح کے رنگ بھی ہیں۔ سنہرے خوابوں کے رنگ بھی ہیں اور خونِ تمنا کا رنگ بھی۔ ان رنگوں کو رَلا ملا کر وہ اس رچاؤ سے بھرے پُرے لفظوں کے خال وخد سنوارتی ہیں کہ ان پر الوہی اپسراؤں کا گمان ہونے لگتا ہے۔ لفظ تو دمکتے ہی ہیں مگر ان کے بطن میں رکھے ہوئے آبدار موتی بھی بہانے بہانے سے لفظوں کی سطح پر آ آ کر اپنی خیرہ کن جھلک دکھاتے ہیں۔ اور نگینہ ہائے معانی کو شرماتے ہیں۔

تسنیم عابدی کی شاعری میں کچھ اور رنگ بھی ہیں جو ان کی تخلیقی دنیا کی تاب وتب میں اضافہ ہی نہیں کرتے بلکہ ان کے تخلیقی رویوں کی پہچان بھی بنتے ہیں۔ آتشِ شوق، غمِ تنہائی، فکرِ دنیا، وجودِ ہستی، چراغِ شبِ غم، سرابِ غمِ ہستی، دشتِ تنہائی، چشمِ احساس اور اس قبیل کی بے شمار ترکیبیں جس نوع کے رنگ ترتیب دیتی ہیں ان کے بارے میں کچھ کہے بغیر بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان آتشیں رنگوں میں دکھ، درد اور غموں کے کتنے انبوہ موجود ہیں اور وہ کس کس طرح پہلو بدل بدل کر شاعرہ کے احساس پر تازیانے کی طرح برس رہے ہیں۔ دکھ، درد اور غموں کا ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں مگر ان کو اپنی طاقت بنا کر جادۂ دشوار کو آسان بنانا اور مرحلۂ شوق کو سہولت کے ساتھ طے کرنا اور سرابِ منزل کو دل افروز صداقتوں میں تبدیل کرنا یقیناً ایک غیر معمولی بات ہے۔

تسنیم عابدی کی شاعری میں ایک رنگ ایسا بھی ہے جو بہت شوخ اور تازہ ہے مگر ان کے یہاں بین السطور میں دھیرے دھیرے سلگتا اور اپنی خوشبو بکھیرتا ہے اور اپنے گرد و پیش کے سارے رنگوں کو اپنی گرفت میں لے کر غیر محسوس انداز میں منقلب کر دیتا ہے۔ یہ رنگ کربلا کی مٹی کا رنگ ہے جو صدیوں بعد بھی ہر عہد اور ہر زمانے میں اپنی مٹی سے جدا نہیں ہوا۔ اس رنگ نے ہماری اُردو شاعری کو جو وقار اور اعتبار بخشا ہے وہ شاید کسی اور رنگ نے نہ بخشا ہو۔ تسنیم عابدی اس حقیقت سے باخبر ہیں۔ ہوسکتا ہے ان کے یہاں اس رنگ کو برتنے کی کوئی شعوری کوشش موجود رہی ہو۔ لیکن جیسا کہ میں نے آغاز میں کہا، انھوں نے اپنی شاعری کو میکانکیت سے صاف بچا کر اسے فطری تخلیقی عمل کا درجہ دیا ہے۔ چنانچہ کربلا کا لہو رنگ بھی ان کے لفظوں اور معانی کے درون میں لاشعوری سطح پر جاگتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ البتہ ایک دو جگہوں پر استثنا موجود ہے جہاں یہ رنگ بے تابانہ پردے سے باہر آ گیا ہے۔

''تماشا'' کی غزلیہ شاعری اپنی علامتوں، استعاروں اور اشاراتی اسلوب کے ذریعے آشوبِ ذات کے سفر کو جس منزل پر پہنچاتی ہے وہاں سے ایک دوسرا سفر آشوبِ کائنات کا شروع ہوتا ہے۔ اس دوسرے سفر کی منزل کہاں ہے؟ اس بارے میں کچھ کہنا ابھی قبل از وقت ہے۔ لیکن یہ بات شاعرہ کے دھیان میں ضرور رہی ہوگی کہ آشوبِ کائنات سے آگے پھر آشوبِ ذات کا سفر درپیش ہے۔ اور اس آگے کے سفر کو طے کرنے کے لیے ان کے کاسۂ ہنر میں اور کتنے رنگ ہیں؟ ایک عمدہ تخلیق کار ہونے کے ناتے وہ یقیناً اس کا پورا ادراک رکھتی ہوں گی۔

تسنیم عابدی کی اس کتاب میں غزلوں کے علاوہ قطعات اور نظمیں اپنی الگ بہار دے رہے ہیں۔غزل کی طرح ان اصناف میں بھی وہ خوب رواں ہیں۔قطعے اور نظم کا مزاج ایسا ہے کہ غزل کی سرگوشی اور نرم خوئی یہاں آ کر صدائے برہنہ اور بلند آہنگ میں تبدیل ہو جاتی ہے اور متخیلہ کے پہلو بہ پہلو مشاہدہ اور تجربہ زیادہ مستعد دکھائی دیتا ہے۔تسنیم عابدی نے ان اصناف کے بنیادی مزاج کو تبدیل کیے بغیر اپنی غزل کی تربیت کو کام میں لا کر ان کی مجموعی فضا تبدیل کرنے کی کوشش ضرور کی ہے۔ چنانچہ ان کے قطعات اور نظموں میں ان کا خاص غزلیہ آہنگ مصرعوں اور سطروں کو سبک اور خوش انداز بنا دیتا ہے جو سماعت پر خوشگوار اثر ڈالتا ہے۔خصوصاً ان کی نظموں میں خیال کا تسلسل،سطروں کی جڑت کے ساتھ رواں گفتگو کا تاثر لیے ہوئے ہے۔خیال کو آگے بڑھنے کے لیے ہموار راستہ ملتا ہے جہاں لفظ خاموشی سے خیال کے ہمراہ چل پڑتے ہیں اور اشارتوں میں اپنی بات کہتے چلے جاتے ہیں۔

تسنیم عابدی کی ''تماشا'' ان کی فنکارانہ صلاحیتوں کا حسین مرقع اور خوبصورت عکس بین ہے۔اللہ کرے وہ اس سفر کو جاری رکھیں اور اپنے کلامِ حسن آفرین سے اہلِ ادب کو نوازتی رہیں۔

ڈاکٹر عبدالکریم خالدؔ

....

تسنیم عابدی کی شاعری میں حزنیہ عناصر

اس امر میں کوئی شک نہیں کہ جب کوئی معاشرہ تذبذب اور گومگو کی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے تو وہاں کے رہنے والوں کی ذہنی ترقی کی رفتار رُک جاتی ہے، لوگ بحرانی کیفیت کا شکار ہوجاتے ہیں اور غیبی مدد کا انتظار کرنے لگتے ہیں۔ معاشرے کے دیگر شعبوں کی طرح ادب پر بھی اس بحرانی دور کا اثر پڑتا ہے اور اُس عہد میں تخلیق ہونے والا ادب زیادہ دوررس اثرات مرتب نہیں کر پاتا۔ ادب کی اس ابتر صورتِ حال میں اگر کوئی شاعرہ مردانہ معاشرے کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرے اور تعجب اس بات پر کہ اس کی باتوں میں گہرائی اور گیرائی بھی موجود ہے۔ اس شاعرہ کا نام تسنیم عابدی ہے جو اپنے تیسرے شعری مجموعے ''تماشا'' کے ساتھ میدانِ شاعری میں اتر رہی ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ اپنی شاعرانہ قیمت کا اندازہ کرنے کے لیے ان کے ہاتھ میں میزانِ کردار ہے:

اپنی قیمت کا بس اندازہ لگانے کے لیے
کتنے خوش فہم ہیں کردار لیے پھرتے ہیں

اب دیکھنا یہ ہے کہ تسنیم عابدی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کس پیرائے میں کرتی ہیں اور ان کے کردار کی مہک کہاں کہاں تک پہنچتی ہے۔

شاعری میں اظہارِ ذات کے کئی طریقے ہیں۔ بعض اوقات شاعر ذاتی مسائل کو آفاقی بنا کر پیش کر دیتے ہیں اور شاعرات کا تو مسئلہ ہی مختلف ہے کہ وہ چہروں کی طرح مسائل پر بھی پردہ ڈال دیتی ہیں۔ تسنیم عابدی کا معاملہ دیگر شاعرات سے جدا ہے کہ وہ آفاقی مسائل کو بھی ذاتی مسائل سمجھتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ دیگر شاعرات کا شعری سفر ذات سے کائنات کی طرف ہوتا ہے جبکہ تسنیم عابدی کا سفر کائنات سے ذات کی طرف ہے۔ یہی سبب ہے

کہ آفاق کی تمام تر سرگرمیاں ان کے انفس میں تلاش کی جاسکتی ہیں۔کمال یہ ہے کہ جب تسنیم عابدی اپنی ذات کا حصار توڑتی ہیں تو انھیں ایک نئی کائنات مل جاتی ہے گویا ان کی ذات میں کئی کائناتیں پوشیدہ ہیں اور ان کی یہی تخلیقی آوارگی انھیں بے چین و بیقرار رکھتی ہے:

حصارِ ذات سے نکلی تو کائنات ملی
عجیب ہوں مری آوارگی نہیں جاتی

دانش مندوں کا کہنا ہے کہ اس کائنات کا سب سے مشکل کام اپنی ذات کا عرفان ہے۔ ہمارا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہم سب اپنی شناخت تک کھو بیٹھے ہیں۔اس صورتِ حال میں ہم کسی دوسرے کے کیا ہو سکتے ہیں کہ ہم اپنے ہونے کی اہلیت سے بھی محروم ہوتے جارہے ہیں۔ تسنیم عابدی کی شاعری میں انسانی ہجوم میں اپنے آپ کو دریافت کرنے کا عزم ملتا ہے۔وہ اس بات پر انتہائی غم زدہ ہیں کہ ان کی زندگی اور ان کے معاشرے نے انھیں اپنا نہیں ہونے دیا:

پوری کوئی بھی تمنا نہیں ہونے دیتے
لوگ مجھ کو مرا اپنا نہیں ہونے دیتے

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تسنیم عابدی کو کس چیز نے اپنا نہیں ہونے دیا۔اس کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ:

عمر رشتوں کے تقاضے ہی نبھاتے گزری
زندگی نے مجھے اپنا کبھی ہونے نہ دیا

تاہم بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو تسنیم عابدی کی پوری شاعری میں درد وغم کا احساس نمایاں ہے۔کبھی وہ اپنے آپ کو چشمِ احساس کا ٹپکا ہوا آنسو قرار دیتی ہیں اور کبھی دشتِ تنہائی کا بھٹکا ہوا آہو۔آپ ان کی اس غزل کا مطالعہ فرمایئے اور دیکھیے کہ وہ اپنی ذات کو کس تناظر میں دیکھتی ہیں:

چشمِ احساس سے ٹپکا ہوا آنسو میں ہوں
تو ہے گر پھول تو پھر پھول کی خوشبو میں ہوں

کس قدر مجھ سے گریزاں ہے یہ وحشت میری
دشتِ تنہائی میں بھٹکا ہوا آہُو میں ہوں

مجھ میں تہذیب و تمدن کا خزانہ ہے نہاں
یوں گریزاں نہ ہو مجھ سے مری اُردو میں ہوں

کب تلک کرتا رہے گا مری ہستی کی نفی
تو قوی جسم ہے اور قوتِ بازو میں ہوں

خامشی سے مری رُک جائے گی یہ نبضِ حیات
اور لب کھولے تو اک نعرۂ باہُو میں ہوں

تسنیم عابدی کی شاعری میں غم والم کی ایک کیفیت اس وقت اُبھرتی ہے جب معاشرے میں بطور عورت ان کی شناخت اور پذیرائی نہیں ہوتی۔ ان کا موقف یہ ہے کہ اس مردانہ معاشرے میں عورت کو اس کا جائز مقام بھی نہیں دیا گیا۔ آپ ان کی اس غزل کا مطالعہ فرمائیے اور اس میں موجزن دردمندی کی لہر محسوس کیجیے:

سوچا نہیں گیا مجھے سمجھا نہیں گیا
تاریخ میں کبھی مجھے لکھا نہیں گیا

میرے ہنر میں عیب نظر آئے اس لیے
معیار پر کبھی مجھے پرکھا نہیں گیا

میں اپنے حق کے واسطے تنہا کھڑی رہی
میزانِ عدل پر مجھے تولا نہیں گیا

غیرت کے نام پر کبھی حرمت کے نام پر
بکتی رہی زمانے میں ، بکنا نہیں گیا

میرے لیے سزا یہی تجویز کی گئی
زندہ رکھا گیا مجھے مارا نہیں گیا

جنگوں میں تھی میں مالِ غنیمت کے طور پر
میرے لیے کبھی مجھے بانٹا نہیں گیا

تسنیم عابدی حساس دل رکھتی ہیں۔ وہ عورت کے دکھوں کو نہ صرف محسوس کرتی ہیں بلکہ انھیں بلند آہنگی کے ساتھ بیان کرنے کا عزم وحوصلہ بھی رکھتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی غزلوں اور نظموں میں محض عورت کی درد بھری کہانیاں ہی بیان نہیں ہوئی ہیں بلکہ انھوں نے شعوری کوشش کی ہے کہ عورت کے نفسیاتی اور عمرانی مسائل کو بھی بلند آہنگی کے ساتھ پیش کریں۔ اس سلسلے میں آپ ان کی نظم ''ریت کے بگولے'' ملاحظہ فرمائیے:

کھنکتے قہقہوں میں
چوڑیوں کی کھنکھناہٹ میں
دمکتے عارضوں پہ
یا لبوں کی مسکراہٹ میں
شجر کی سرسراہٹ میں
مری بستی بھی فانی اور یہ جذبے بھی فانی ہیں
مسرت ختم ہو جاتی ہے غم کی دھوپ چھاتی ہے
کلائی خالی ہو جاتی ہے چوڑی ٹوٹ جاتی ہے
گلوں کی پتیاں جھڑتی ہیں، شاخیں سوکھ جاتی ہیں
سراغ زندگی میں آنکھیں میری تھک سی جاتی ہیں
تو میں تھک ہار کر اک درد کی دہلیز پر بیٹھی
زمین و آسماں کے درمیاں کچھ تکنے لگتی ہوں
بگولے ریت پر پھر رقص کرتے مجھ سے کہتے ہیں
تمھیں کیا زیست کے مفہوم اور معنی سمجھنے ہیں
ذرا سی خاک اُٹھا کر تم فضاؤں میں اڑا دینا
یہی ہے زندگانی اور یہی ہستی تمھاری ہے
ہمارا رقص جاری ہے، ہمارا رقص جاری ہے
بھٹکتی روح کی صورت ہمارا رقص جاری ہے

تسنیم عابدی اس بھری پُری دنیا میں تنہائی کا شکار ہیں۔اس تنہائی کے کئی روپ ان کی شاعری میں جلوہ گر ہوئے ہیں۔وہ اپنے آپ کو اس لیے بھی تنہا محسوس کرتی ہیں کہ ان کے ہم مزاج و ہم خیال لوگ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ان کی تنہائی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ خاندان میں خود کو تنہا محسوس کرتی ہیں:

ایسی تنہائی ہے کہ سوچتے ہیں
کیا کوئی خاندان میں نہ رہا

وہ اکیلے ہی تنہائی کا زہر پیتی ہیں۔اس غم انگیز کیفیت میں بھی وہ دولتِ درد کو اپنی ذات میں پوشیدہ رکھتی ہیں۔انھیں علم ہے کہ غم دم کے ساتھ ہے اور انھیں چراغِ شبِ غم کے ہاتھوں اسی طرح جلتے رہنا ہے۔اپنی اس بے بسی و بے کسی کو انھوں نے درج ذیل غزل میں ابھارنے کی کوشش کی ہے:

ہم تماشا ہوئے یوں اہلِ کرم کے ہاتھوں
دشتِ دل لٹ گیا اک آ ہوئے رم کے ہاتھوں

سوچتے ہیں تجھے اب اور کہاں ڈھونڈیں ہم
عقل بھٹکی ہے سدا دیر و حرم کے ہاتھوں

میں بدل جاؤں تو حیرت کی کوئی بات نہیں
کیا سے کیا ہو گیا کعبہ بھی صنم کے ہاتھوں

لَو تمناؤں کی دامن نہ جلا ڈالے کہیں
مجھ کو بجھنا ہے چراغِ شبِ غم کے ہاتھوں

اپنی مرضی کا کہاں ہے یہ وجودِ ہستی
اک کھلونا ہوا انسان عدم کے ہاتھوں

لوگ سچّے ہی سرِ دار لٹکتے دیکھے
حرفِ حق کھنچ گئے قرطاس وقلم کے ہاتھوں

اگر ہے نخلِ تمنا خزاں رسیدہ تو کیا
بہار آئے گی موسم بدل ہی جائے گا

تسنیم عابدی کے خیال میں یہ دنیا محض ایک تماشا ہے اور بے بس عورت تماشائی۔ اس عورت کی ڈور کسی اور کے ہاتھوں میں ہوتی ہے اور وہ کٹھ پتلی کی طرح اپنی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک ہمارے معاشرے کی عورت کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ تماشائی سے تماشا بن گئی ہے:

ہے تماشے کا اختتام یہی
جب تماشا بنے تماشائی

آپ ان کی مختلف غزلوں کے درج ذیل چند اشعار ملاحظہ فرمایئے اور دیکھئے کہ وہ تماشے اور تماشائی کو کس تناظر میں دیکھنے اور دکھانے کی سعی کرتی ہیں:

نظر حیران ہے کیا ہو رہا ہے
تماشے پر تماشا ہو رہا ہے

تماشے میں پسِ پردہ سبھی کردار بے بس تھے
سحر کاری تھی ساری، ہم اداکاری نہ کرتے تھے

دیدۂ شوق تو آمادہ رہا ہے ہر دم
کبھی خود کو وہ تماشا نہیں ہونے دیتے

راز کا بزم میں چرچا کبھی ہونے نہ دیا
ہم نے اپنے کو تماشا کبھی ہونے نہ دیا

تسنیم عابدی اس آب وگِل کی دنیا میں سلیقے سے زندگی بسر کرنے کی متمنی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو کبھی تماشا نہیں بننے دیا۔ یہ مثبت تخلیقی عمل سہل نہیں۔ اس میں صبر وضبط کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور ہمت وتوانائی کی بھی۔ وہ اپنے دل سے خطاب کرتے ہوئے کہتی ہیں:

ضبط کے سارے مراحل سے گزر جا، اے دل
دولتِ درد کو دنیا سے نہاں رکھنا ہے

تسنیم عابدی ذات کا کرب سہتی ہیں مگر اپنی تکلیفوں کو منظرِ عام پر لانے سے گریزاں ہیں۔ یہ ان کی خوش دلی بھی ہو سکتی ہے اور دریا دلی بھی۔ یہاں یہ امر پیشِ نگاہ رہے کہ تسنیم عابدی زندگی گزارنے کو ایک فنکاری تصور کرتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ ہمارے معاشرے میں عورت کو اپنی زندگی بسر کرنے کے لیے بھی فنکاری کرنا پڑتی ہے گویا اس کی زندگی ایک اداکاری کے علاوہ کچھ نہیں۔ تسنیم عابدی اپنی نظم ''زندگی ہے فنکاری'' میں انکشاف کرتی ہیں:

کھلی ہوا میں چلو سانس لیں کہ کمرے میں
گھٹن بہت ہے اُداسی ہے سوگواری ہے
ہماری آنکھوں میں برسوں کی شب بیداری ہے
کبھی کبھی تو یہ احساس بڑھتا جاتا ہے
کہ جیسے زندگی گنتی ہے رات کی مانند
اک ایسی رات کہ جس کو ہمیں گزارنا ہے
بغیر نیند کے خوابوں کے، اور تاروں کے
تمام رات کا حاصل ہو کروٹیں لینا

یہ کروٹوں کا سفر، کس قدر کٹھن ٹھہرا
شبِ حیات کو طے کرنا ایک فن ٹھہرا
سو ہم بھی رات گزاریں گے اس طرح اپنی
کہ کروٹوں کی شکن زندگی کی چادر پر
کوئی بھی دیکھنے والا نہ دیکھ پائے گا
ہماری آنکھ میں آنسو کبھی نہ آئے گا
شبِ حیات کا فن آتے آتے آئے گا

تسنیم عابدی کی ذات میں غموں کی ایک کائنات آباد ہے۔ اس غم کدہ میں معاشرتی آلام

مزید اضافہ کر دیتے ہیں ۔ وہ ایک حساس عورت کی نگاہ سے کائنات کو دیکھتی ہیں تو انھیں کُل کائنات سیہ پوش دکھائی دیتی ہے۔انھیں بزمِ جہاں میں ہر چیز دکھ اور درد کی علمبردار نظر آتی ہے اور وہ چلاّ اٹھتی ہیں:

پتے پتے پر ہے شبنم
بزمِ گل ہے بزمِ ماتم

ان کے خیال میں ہمارے معاشرے کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ یہاں سے امن وسکون رخصت ہوگیا ہے۔معاشرتی ابتری نے انسان کی زندگی اجیرن کر دی ہے۔خوشی اور خوشحالی نام کی ہر چیز معاشرے سے ناپید ہوگئی ہے اور زندگی موت سے بھی بدتر ہوگئی ہے:

اب خوشی میں کوئی خوشی نہ رہی
زندگی جیسے زندگی نہ رہی

اس صورتِ حال میں تسنیم عابدی افسردہ و دل شکستہ ہو کر بارگاہِ رب العزت میں دعا گو ہیں کہ مالکِ دو جہاں ہی ہمارے معاشرے کو خوشحال بنائے۔وہ اپنے قارئین سے استدعا کرتی ہیں کہ:

پڑھتے رہیے نمازِ خوف کہ اب
کوئی امن و امان میں نہ رہا

تسنیم عابدی اس ذاتی کرب اور معاشرتی آلام میں بھی رجائیت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتیں۔ایک جانب تو وہ معاشرتی رویوں کا رونا اس لیے بھی روتی ہیں کہ سارا جہان ہی غم والم کا شکار ہے:

گردشِ دوراں کا کیا رونا
گردش میں ہے سارا عالم

اور دوسری جانب انھیں خبر ہے کہ اگر معاشرے کے ظلم وستم کے سامنے ہتھیار ڈال دیں گی تو ان کا پورا وجود شکست خوردہ ہو جائے گا۔یہی سبب ہے کہ معاشرے کی چکّی میں پسنے کے باوجود وہ نہ تو اپنے لہجے کو شکستہ ہونے دیتی ہیں اور نہ اپنے رویوں کو زنگ آلود۔یہ طرزِ احساس رجائیت کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے:

ہم کو اس گردشِ دوراں نے کہیں کا نہ رکھا
پھر بھی لہجے کو شکستہ کبھی ہونے نہ دیا

تسنیم عابدی معاشرے کی اچھی اور پائیدار قدروں کی بحالی چاہتی ہیں۔ وہ اپنے معاشرے میں حق گوئی، نیکی، حیا، خلوص، مروّت اور پاکبازی جیسی اعلیٰ قدریں رائج کرنے کی متمنی ہیں لیکن جب معاشرہ ان اعلیٰ اخلاقی قدروں کو پامال کرتا ہے تو وہ خون کے آنسو رونے لگتی ہیں۔ آپ ان کی نظم ''پرانے سکے'' ملاحظہ فرمائیں گے تو دیکھیں گے کہ انھوں نے کس طرح مختلف علامات، تلمیحات اور اشارات کے ذریعہ اپنا مؤقف اُجاگر کرنے کی بلیغ سعی کی ہے۔

تسنیم عابدی کی شاعری میں کربلا کا استعارہ ایک نیا جہانِ معنی لیے ہوئے ہے۔ جب وہ ذاتی دکھوں اور معاشرتی مصائب کے باعث تنہائی کا شکار ہو جاتی ہیں تو کربلا کی یادوں سے اپنے دل کے عزاخانے کو سجا لیتی ہیں۔ اس صورتِ حال میں وہ تنہا ہو کر بھی تنہا نہیں رہتیں:

سر جو نیزوں پر فروزاں ہیں وہ ہیں ساتھ مرے
میری تنہائی کو تنہائی نہ سمجھا جائے

کرب و بلا کا واقعہ حق و صداقت کے علمبرداروں کے لیے رہنمائی کا فریضہ ادا کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اب تمام زمینیں ''کربلا'' بن چکی ہیں اور ہر یوم اپنی کیفیت کے اعتبار سے ''عاشورہ'' ہے۔ تسنیم عابدی کا مؤقف یہ ہے کہ ان کی نگاہوں کے سامنے ظلم و ستم کا بازار گرم ہے۔ ظالم مظلوم کو سرِ دار چڑھا رہا ہے اور نیزوں کی نوک پر سروں کی فصلیں تیار کھڑی ہیں:

گلی کوچوں میں اک مقتل سجا ہے
جدھر دیکھو اُدھر اک کربلا ہے

تسنیم عابدی کی شاعری میں مقتل، فرات، تشنگی، نوکِ نیزہ، دریا، تشنہ دہن، عزاداری، کوفہ، بیعت، شام، خیمۂ دل، خونِ ناحق اور اسی قبیل کے بیسیوں الفاظ احساس دلاتے ہیں کہ وہ کربلا کے واقعہ سے نہ صرف متاثر ہیں بلکہ اسے جدید تناظر میں دیکھنے کی عادی ہیں۔ وہ کربلا کو حق و ناحق کے درمیان حدِ فاصل سمجھتی ہیں۔ آپ ان کی غزلوں کے درج ذیل اشعار کا مطالعہ فرمائیے اور دیکھیے کہ

انھوں نے واقعہ کربلا کو کس طرح اپنی ذات اور معاشرے سے منسلک کرنے کی مشکور سعی کی ہے:

کسی طرح سے مری تیرگی نہیں جاتی
لبِ فرات بھی اب تشنگی نہیں جاتی

شرم سے ڈوب گیا مہرِ منور آخر
نوکِ نیزہ پہ چمکتا جو کوئی سر ٹھہرا

کسی تشنہ دہن کے بعد ہم نے
بھرے دریا کی دیکھی تشنگی ہے

سر کٹانے کی سعادت پر نہ مجبور کرے
پھر یہ کوفہ کسی بیعت پہ نہ مجبور کرے

اس بار مدینے ہی میں در آیا تھا کوفہ
اس بار کیا ہم نے سفر اور طرح کا

شامِ تنہائی نے یہ حشر اٹھایا کیوں تھا
خیمۂ دل کی طنابوں کو جلایا کیوں تھا

خونِ ناحق مرا مٹی میں ملانے والو
سر سوالی ہے کہ نیزے پہ چڑھایا کیوں تھا
شہرِ ناپرساں کی گلیوں میں پھری ہوں تنہا
کوفۂ عصر میں ہر شخص پرایا کیوں تھا

''شجرۂ نسب'' ان کی ایک منفرد نظم ہے تسنیم عابدی کی شاعری میں کربلا کے تلازمات اتنی کثرت سے استعمال ہونے کے دو بنیادی اسباب ہیں۔ پہلا سبب تو یہ ہے کہ ان کی رگوں میں خانوادۂ رسالت کا لہو موجزن ہے اور وہ اس پر فخر بھی کرتی ہیں۔ کربلا سے تسنیم عابدی کے تعلقِ خاطر کا دوسرا سبب یہ ہے کہ ان کے خیال میں اگر عصرِ نو میں ہم میدانِ کربلا میں کھڑے ہیں

تو ہمیں حسینی کردار بھی ادا کرنا چاہیے:

عجب تھی تعزیت کی رسم شہر خونِ ناحق میں
نمک پاشی تو کرتے تھے عزاداری نہ کرتے تھے

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا تسنیم عابدی نے اس میدانِ کارزار میں اپنا کردار ادا کیا؟ یہی وہ مقام ہے جہاں تسنیم عابدی کی شاعری ہم عصروں میں ممتاز ہو جاتی ہے۔ ان کا مؤقف یہ ہے کہ کرب و بلا کے میدان میں حسینؑ اور اصحابِ حسینؑ کی بے مثال قربانیاں اپنی جگہ لیکن اگر زینبؑ وکلثومؑ اس کی تشہیر نہ کرتیں تو یہ خونِ ناحق کربلا تک محدود ہو جاتا۔ اسی بات کو دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ واقعۂ کربلا کو ایک عورت نے تحریک بنا دیا ہے۔ کربلا کے واقعہ میں یقیناً امام عالی مقام نے اپنے خون سے رنگ بھرا ہے۔ لیکن اس لہو کی مہک کو زندگی اور تابندگی حضرت زینبؑ کے طرزِ عمل اور طرزِ احساس سے ملی ہے۔ آپ ان کی غزل کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے:

راہِ عشق میں کام جو کوئی کر جاتی
زندہ رہنے کی خاطر میں مر جاتی

صحرا ، شام کا سناٹا اور تنہائی
سورج ڈوبتا ، جب میں اپنے گھر جاتی

خونِ ناحق صحرا ہی میں چُھپ جاتا
کیا ہوتی تشہیر اگر میں ڈر جاتی

میرے نزدیک تسنیم عابدی کا اختصاص یہ ہے کہ انھوں نے اپنی غزلوں میں محض کربلا کے تلازمات ہی کو استعمال نہیں کیا بلکہ ایک عورت کے کردار و اعمال کے مثبت پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے اور احساس دلایا ہے کہ جہاں جا کر تنظیمی یعنی مردانہ معاشرہ ختم ہو جاتا ہے وہاں سے تخلیقی یعنی نسوانی معاشرے کی حدیں شروع ہو جاتی ہیں:

عصر تک کام آ گیا بھائی
شام کو یاد اک بہن آئی

تسنیم عابدی کی شاعری محض قافیہ پیمائی نہیں بلکہ وہ مخزنِ ادراک سے حروف کے موتی چنتی ہیں ۔اصل بات یہ ہے کہ جب انفس و آفاق کا غم شعر کے قالب میں ڈھالنا ہو تو محض فاعلاتن، فاعلات سے کام بھی نہیں چلتا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تسنیم عابدی اپنی شعری کائنات کو کیسے سجاتی ہیں اور شاعری کرتے ہوئے کن باتوں کو مدِ نظر رکھتی ہیں؟ سب سے پہلے تو ان ہی کی زبان سے سنیے۔ وہ اپنی نظم ''کسبِ سخن''، میں کہتی ہیں:

چُنے ہیں مخزنِ ادراک سے حروفِ گہر
زمینِ لفظ سے معنی کشید کرتے ہوئے
قرأتوں کے سمندر میں لہر لہر حروف
ہمارے خوابِ پریشاں کو مجتمع کرکے
کفِ سطور پہ آ کر بکھر سے جاتے ہیں
مگر حروف و معانی سے ماورا اکثر
اثر کلام کا دل میں اُتر سا جاتا ہے
صحیفہ دل کا ہے الہامی اور مرے افکار
جبیں کی لوح پر آ کر چمکنے لگتے ہیں
میں کشفِ ذات سے کسبِ سخن کماتی ہوں

کشفِ ذات سے کسبِ سخن کمانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ تسنیم عابدی نے تخلیق کا کرب نہ صرف محسوس کیا ہے بلکہ اپنی شاعری کو بھی اس کی آنچ سے خوب گداز کر دیا ہے۔

آپ تسنیم عابدی کی شاعری کا مطالعہ فرمایئے تو آپ دیکھیں گے کہ انھوں نے تخلیق کے کیا کیا روپ اُبھارے ہیں اور اس جانکاہی کے عمل میں وہ کس حد تک کامیاب و کامران ہیں۔

تسنیم عابدی کی شاعری کربِ تخلیق کا صلہ ہے ۔ ان کی غزلوں اور نظموں کا مطالعہ فرمایئے تو آپ دیکھیں کہ بعض منفرد موضوعات کو انھوں نے اتنے سلیقے اور مہارت سے پیش کیا ہے کہ تسنیم عابدی پر کلاسیکی شاعرہ کا گمان ہونے لگتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تسنیم عابدی کی غزلوں

میں انفرادیت بھی ان کی کلاسیکی روایت سے ربط کے باعث جلوہ گر ہوتی ہے۔آپ ان کی مختلف غزلوں کے منتخب کردہ اشعار کا مطالعہ فرمایئے اور دیکھیے کہ دستِ ہنر کس طرح صفحۂ قرطاس پر رنگوں کو سلیقے سے بکھیرتا ہے:

روح ہے مائلِ پرواز تو یہ جسم اسے
ایک مٹی کی عمارت پہ نہ مجبور کرے

کیا گلہ تم سے کریں تم نہیں رک پائے اگر
میری بھی آنکھ کا آنسو تو نہ پل بھر ٹھہرا

اک لباس اور وہ بھی سادہ سا
آخری پیرہن پہ غور کیا

بستیوں میں تھی اگر امن کی خواہش تم کو
فوج کو جنگ کے میدان میں رہنے دیتے

وہی ہے چاک پہ گردش میں عنصر
ہنر میں دستِ کوزہ گر نہیں ہے

چشم و لب، عارض و رخسار لیے پھرتے ہیں
بیچنے کے لیے بازار لیے پھرتے ہیں
کچھ ذرا ٹھہر تمنائے چراغِ ہستی
آنکھ میں حسرتِ دیدار لیے پھرتے ہیں

میں بدل جاؤں تو حیرت کی کوئی بات نہیں
کیا سے کیا ہو گیا کعبہ بھی صنم کے ہاتھوں
لوگ سچّے ہی سرِ دار لٹکتے دیکھے
حرفِ حق کھنچ گئے قرطاس و قلم کے ہاتھوں

حیرتیں آنکھ میں ، دل میں غمِ جاں رکھنا ہے
ہم کو معلوم ہے کس شے کو کہاں رکھنا ہے
اے سرابِ غمِ ہستی یہ بتا دے مجھ کو
اک قدم اور تمنا کا کہاں رکھنا ہے

دل کا یقین آنکھ کی حیرت نہیں گئی
پیغمبری تو مل گئی لکنت نہیں گئی

خوب چرچے ترے ہنر کے رہے
ہم نے بھی اپنے فن پہ غور کیا

بساطِ فن پہ مصوّر نہ کھینچ صورت کو
ہمارے عکس میں پہلا سا اب جمال نہیں

سب سے محفوظ مقامِ غمِ تنہائی ہے
فکرِ دنیا نے اکیلا کبھی ہونے نہ دیا

غنچۂ دل نہ کھلا سکتے تو اتنا کرتے
سوکھے پھولوں کو ہی گلدان میں رہنے دیتے

زندگی بھر کی رفاقت کی ضرورت کیا ہے
پھول اک جھونکا ترا بادِ صبا مانگے ہے

دل کی حالت کا بتانا تھا بہت دشوار جب
آنکھ کا آنسو بنا پھر ترجمانِ آرزو

دامنِ تر زمانہ دیکھا کیا
آپ کرتے رہے وضو صاحب

خلا ہے مجھ میں کچھ اندر نہیں ہے
مگر کچھ خاک کے اندر نہیں ہے

جس نے تسنیم جلائے ہیں بناوٹ کے چراغ
اُس کی رعنائی کو رعنائی نہ سمجھا میں نے

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ مؤقف اختیار کیا تھا کہ تسنیم عابدی کی شاعری میں غم ایک اساسی قدر کی حیثیت سے جلوہ افروز ہوتا ہے۔ کبھی یہ غمِ ذات کے نہاں خانوں کا چکر لگاتا ہے اور کبھی یہ کائنات کے اسرار سے سربستہ رازوں کو منکشف کرتا ہے۔ تسنیم عابدی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری میں درد و غم کے تمام ذائقوں کو سمو دیا ہے۔ اس بات کو دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ تسنیم عابدی کے شعری قفل کو صرف اور صرف کلیدِ غم سے کھولا جا سکتا ہے۔ اگر کسی کے پاس یہ کنجی نہیں ہے تو وہ تسنیم عابدی کی شعری کائنات کے قفل کو ہرگز ہرگز نہیں کھول سکتا ہے:

قالبِ شعر میں ہر غم کو سمونا ہے تو پھر
شعر کو قافیہ پیمائی نہ سمجھا جائے

ڈاکٹر شبیہ الحسن

....

تسنیم عابدی......جدید لہجے کی شاعرہ

تسنیم عابدی عہدِ حاضر کی معروف شاعرہ ہیں ان کا کلام اس حقیقت کا ترجمان ہے کہ ادب زندگی کی کشمکش کے اظہار کے طور پر جنم لیتا ہے۔تسنیم عابدی نے اپنے جذبات، احساسات، تجربات اور مشاہدات کو بیان کرنے کے لیے غزل اور نظم دونوں اصناف کا سہارا لیا ہے۔

ان کا مجموعۂ کلام ''تماشا'' ان کی شاعرانہ عظمت کی مکمل گواہی ہے۔ان کی شاعری میں زندگی اپنے مثبت اور منفی دونوں رویوں کے حوالے سے جلوہ گر ہے۔ جہاں تک شعری موضوعات کا تعلق ہے تو ''تماشا'' میں قدیم اور جدید دونوں موضوعات پر طبع آزمائی کی گئی ہے بلکہ بعض اچھوتے موضوعات بھی شعری لباس زیبِ تن کیے موجود ہیں۔تسنیم عابدی نے قدیم موضوعات پر محض روایت کی پاسداری کے لیے زورِ قلم صرف نہیں کیا بلکہ ان کی ریاضت اور خونِ جگر کی شمولیت نے ان موضوعات میں زندگی کے نئے رنگ بکھیر دیئے ہیں اور کہیں بھی کہنگی کا احساس نہیں ہوتا۔اب دیکھنا یہ ہے کہ تسنیم عابدی کیا کہنا چاہتی تھیں؟ انھوں نے کیا کہا ہے؟ اور اپنی اس کوشش میں وہ کہاں تک کامیاب و کامران ہیں؟ انھوں نے مافی الضمیر کے بیان میں جو الفاظ استعمال کیے ہیں وہ ابلاغ کے لیے کہاں تک موزوں ہیں؟ ان کا طرزِ اظہار کلام میں تاثیر پیدا کرنے میں کس حد تک ممد و معاون ثابت ہوا ہے؟ یہ مضمون انھی سوالات کا جواب ہے۔

تسنیم عابدی کی ''تماشا'' اپنی جگہ ایک انفرادیت اور وحدت کی حیثیت رکھنے کے باوجود ادب کی روایت کا ایک معتبر حصّہ بننے کی پوری صلاحیت سے مالا مال ہے اور اِس میں اپنے خالق کی شعوری قوت کا برملا اظہار ملتا ہے۔تسنیم عابدی ''ادب اور زندگی'' کے تعلق کے نظریے پر یقین رکھتی ہیں۔ان کے نزدیک شاعری ایک آرٹ ہونے کے باوجود بے مقصد سرگرمی نہیں۔ وہ شاعر

کوایک ذمہ دارفن کار سمجھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری اس حقیقت کا اظہار ہے کہ شاعری بنیادی طور پر احساسات وتجربات سے تخلیق ہوتی ہے جن سے شاعر زندگی میں دوچار ہوتا ہے۔

تسنیم عابدی کی شاعری میں ایسے موضوعات بھی نظر آتے ہیں جو بالکل نئے ہیں اور ایسے بھی ہیں جس سے ہم آگاہ ہیں لیکن تسنیم عابدی کا شاعرانہ کمال یہ ہے کہ انھوں نے ان معلوم موضوعات سے ہمارے احساسات کو مزید تقویت بخشی ہے اور ہم اپنے آپ کو ان موضوعات سے مزید قریب محسوس کرتے ہیں۔

تسنیم عابدی کا شماران حساس انسانوں میں ہوتا ہے جن کے لیے آگہی ایک عذاب ہے۔ جب وہ عذابِ آگہی کے تجربے سے گزرتی ہیں تو ان کے احساسات ان اشعار میں ڈھل جاتے ہیں:

خود شناسی کے طلسمات سے تو بہتر تھا
مجھ کو پریوں کے شبستان میں رہنے دیتے

نہیں ہیں معتبر اپنی نظر میں
نہ جانے کیسا کربِ آگہی ہے

فارسی شاعری سے اُردو شاعری میں منتقل ہونے والا فلسفہ جبر وقدر میر سے لے کر ناصر کاظمی تک کے بیشتر شعرا کا محبوب موضوع ہے۔ تسنیم عابدی کی ''تماشا'' میں ''تقدیر کا جبر'' بھی ایک موضوع ہے اور بسا اوقات یہ یاسیت کی انتہاؤں کو چھونے لگتا ہے۔ حوالے کے طور پر چند اشعار دیکھیے:

زندگی جبرِ مسلسل میں ہے گزری اپنی
زہر بن جائے جو اب ایسی دوا مانگتے ہیں

اک اذاں اور نماز کا وقفہ
زندگی کتنی مختصر پائی !

آبیاری ، ہی نہ ممکن ہو، جہاں پر تسنیم
وہ شجر ایسا ارادوں کا لگایا کیوں تھا

یہ درست ہے کہ تسنیم عابدی زندگی کے جبر سے نالاں ہیں لیکن یہ رویہ یہاں کی شاعری کا مجموعی رویہ نہیں اس لیے کہ ان کے بعض اشعار ان کی رجائیت کے غماز بھی ہیں۔ یوں زندگی کے مثبت اور منفی رویوں کا شاعرانہ اظہار تسنیم عابدی کو ایک متوازن شخصیت کے روپ میں سامنے لاتا ہے۔ ایک قطعہ اس حوالے سے ملاحظہ کیجیے:

چراغِ وصل کسی طور جل ہی جائے گا
فراق و ہجر کا سورج ہے ڈھل ہی جائے گا
اگر ہے نخلِ تمنا خزاں رسیدہ تو کیا
بہار آئے گی موسم بدل ہی جائے گا

تسنیم عابدی ایک ''عورت'' ہیں انھیں عورت سے ہونے والے امتیازی سلوک اور اس پر ڈھائے جانے والے مظالم کا بخوبی ادراک ہے۔ اس سماجی المیے کے حوالے سے ان کی نظم ''آدھی گواہی'' پیش کی جا سکتی ہے:

کِس کی بیٹی ہوں
اور بہن کِس کی
کِس کی بیوی ہوں
اور ہوں ماں کِس کی
میری اپنی کوئی شناخت نہیں
جرم کے باب میں تو پوری ہوں
پھر بھی آدھی گواہی ہے میری
میرے الجھے سوال پر بولا
کیسی خودسر ہے تو خدا کی پناہ
کتنے باغی خیال ہیں تیرے
تو جو اپنی شناخت چاہتی ہے
پیدا ہوتے ہی مر گئی ہوتی

عورت کی بے بسی، مظلومی اور مردوں کے ہاتھوں رسوائی کی کہانی بڑی پرانی ہے۔ تسنیم عابدی کے قلم سے حوا کی بیٹی کے حقوق کی پامالی اور سرِ بازار اس کی نیلامی پر خون کے آنسو

ٹپکتے ہیں۔ چند آنسو آپ بھی ملاحظہ کیجیے:

میں اپنے حق کے واسطے تنہا کھڑی رہی
میزانِ عدل میں مجھے تولا نہیں گیا
عزت کے نام پر کبھی حرمت کے نام پر
بکتی رہی زمانے میں بکنا نہیں گیا
جنگوں میں تھی میں مالِ غنیمت کے طور پر
میرے لیے کبھی مجھے بانٹا نہیں گیا

تسنیم عابدی کی شاعری میں اخلاق وسیاست کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ جرأتِ رندانہ بھی موجود ہے۔ طنز کی چبھن بھی ہے جو کہیں کہیں نشتر کا روپ دھار لیتی ہے۔ اپنی بات کے ابلاغ اور جذبات واحساسات کے شاعرانہ اظہار کے لیے انھوں نے تلمیحات کا سہارا بھی لیا ہے۔ ذیل کے چند اشعار حوالے کے طور پر ملاحظہ فرمایئے:

عمر رشتوں کے تقاضوں کو نبھاتے گزری
زندگی نے مجھے اپنا کبھی ہونے نہیں دیا

اسے میں اس کی طرح سے جواب دے نہ سکی
مرے مزاج سے شائستگی نہیں جاتی

سیاست کے لیے اس مملکت میں
ہر اک قاتل مسیحا ہو رہا ہے

مصلحت کوشی کی زحمت پہ نہ مجبور کرے
وہ ہمیں جرمِ سیاست پہ نہ مجبور کرے

اربابِ قفس کی دریا دلی کس طرح بتائی جائے تمھیں
اک روزنِ در کھلوایا ہے، کچھ کلیاں بن کھلی بھیجی ہیں

جو مری آستیں میں پل رہے تھے
انہی سانپوں نے مجھ کو ڈس لیا ہے

گلی کوچوں میں اب مقتل سجا ہے
جدھر دیکھو ادھر اک کربلا ہے

سر کٹانے کی سعادت پہ نہ مجبور کرے
پھر یہ کوفہ کسی بیعت پہ نہ مجبور کرے

شرم سے ڈوب گیا مہرِ منور آخر
نوکِ نیزہ پہ چمکتا جو کوئی سر دیکھا

تسنیم عابدی کی ''تماشا'' محض موضوعات کے حوالے سے قابلِ تحسین ہی نہیں بلکہ ان موضوعات کے شاعرانہ اظہار میں اس کی عظمت پوشیدہ ہے اس حوالے سے دیکھا جائے تو تسنیم عابدی معاصر شعرا کی صفِ اوّل میں جگہ پانے کی حق دار ہیں۔تشبیہ واستعارہ کے زیور سے سجی ہوئی ''تماشا'' کو حسین قوافی اور مترنّم ردیفوں نے ساحری بنا دیا ہے۔

مختصر یہ کہ تسنیم عابدی کی شاعری متنوع موضوعات اور اسالیب کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔الفاظ کی سادگی، تراکیب کی چُستی، صنائع بدائع کے برمحل اور موزوں استعمال نے ان کے کلام میں سلاست، روانی اور ایسی خوشگوار موسیقیت پیدا کر دی ہے جس کا ذائقہ ہر سخن فہم اور زبان شناس بخوبی محسوس کر سکتا ہے۔

ڈاکٹر سیّد نواز حسن زیدی

....

پیش لفظ

خورشیدِ وصل ڈھل چکا ہے۔ زندگی کی ساری رعنائیاں غروب ہو چکی ہیں، تمنا کے خیموں سے دھواں اٹھ رہا ہے۔ سکوتِ عصر میں دل کی دھڑکن گونج رہی ہے اور میں اس گونج کو الفاظ میں ڈھالنے کی کوشش میں سرگرداں ہوں۔ مجھے محبت کی داستان لکھنا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ وقت کے ہاتھوں یہ داستان تلف ہو جائے۔ یہ محبت کی داستان ہے اور اسے باقی رہنا ہے۔ میں نے تمام زندگی محبت کمائی اور بے دریغ محبت لٹائی بھی ہے۔ اسی لیے ہار کر بھی جیت چکی ہوں۔ مجھ پر محبت کی دیوی مہربان رہی، اسی لیے بے مانگے نویدِ وصل سنائی دی...مگر اب بشارتِ ہجر بھی تو بغیر طلب کے دی جا چکی ہے۔ ہر قدم پر اسرارِ حیات منکشف ہو رہے ہیں۔

زمان و مکاں یا روح اور جسم یا وقت اور مٹی، کائنات کے ان شش جہات راستوں سے میں کشاں کشاں گزر رہی ہوں، میرے اردگرد تماشائیوں کا ہجوم ہے اور میں تماشا بنے بغیر بابِ ساعت پر روک دی گئی ہوں۔ یہ میرا تماشا کیا کریں گے؟ یہ تماشائی تو خود تماشا ہیں۔ دربارِ رسومات کو سجایا جا چکا ہے، مکر و ریا کو خلعتِ فاخرہ پہنا دی گئی ہے۔ اندھی تقلید تجاہلِ عارفانہ کے تازیانوں کا نشانہ بنا چکی ہے، اکیس ویں صدی کی روشن خیالی آنکھوں کو چکا چوند کر چکی ہے اور میں اس عالمِ وحشت میں تہذیب کے ملبے سے اپنے آثار کو جمع کرنے کی کوشش میں ہوں۔ جہاں جہاں سے گزر رہی ہوں، محبت کی تخم ریزی کرتی جا رہی ہوں، اس یقین کے ساتھ کہ وقت سب کچھ مٹا دیتا ہے مگر محبت کے آثار باقی رہتے ہیں اور پھر انھیں آثار سے نیا شہر دریافت ہوتا ہے۔

میں ایک عورت ہوں، کیا میں واقعی موجود ہوں؟ کیا مجھے صرف تمھاری نظر سے اپنے کو محسوس کرنا ہے؟ میں آخر اپنے لیے کیوں معدوم ہوں؟ کیا میں کائنات کا صرف ایک منظر ہوں جس میں سارے رنگ تم اپنی مرضی سے بھرتے ہو اور پھر اپنی مرضی سے اپنے اختیار کے برش سے

جب چاہو مجھے بے رنگ یا بدرنگ کر سکتے ہو؟ پھر مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ میں صرف منظر نہیں ناظر بھی ہوں، میں بھی دیکھتی ہوں، میں بھی تو رنگ بھر سکتی ہوں، میں صرف قبول کرنے کا نہیں رد کرنے کا بھی اختیار رکھتی ہوں۔ میں معشوق ہونے کے علاوہ عاشق ہونے کی صلاحیت بھی رکھتی ہوں، میں کچھ اپنے جسم و جاں اور خدوخال سے بھی ماسوا ہوں۔ سنو، ہماری سمتیں مختلف نہیں ہیں، تم مجھے دریافت کیوں نہیں کرتے، کیسے ہم سفر ہو جو میری رائیگانی پر مطمئن ہوتے ہو...

اسی لیے میں نے اس معاشرے سے عالمِ عجلت میں بہت کم سیکھا۔ کچھ نیا نہیں سیکھا مگر بہت کچھ ان سیکھا چھوڑ دیا۔ یہ وقت کی مہربانی ہے، وقت بہت پراسرار ہے اور شبدوں بھری میری مٹی کو نجانے کیا کیا سمجھا تا رہا ہے۔ ساری زندگی سیکھنے سے زیادہ ان سیکھنے میں خود کو مصروف رکھا، اس لیے محبت کے باوجود احساسِ تنہائی بڑھتا گیا۔ اَن سیکھے پن کی طرح اَن کہی نے بھی بڑی چھب دکھائی۔ میرا عزیز قاری مجھے کہی اور اَن کہی میں تلاش کر لیتا ہے۔

''ردائے ہجر'' میری تخلیق ہے، یہ میری خودکلامی کی کیفیت ہے۔ میں اس جرم کی مرتکب ہوں مگر اس کی طباعت کا گناہ انیق احمد کے سر جاتا ہے جو میرا مسوّدہ اٹھا کر لے گیا اور مبین مرزا کے حوالے کر دیا۔

میں تہہ دل سے محترم خورشید رضوی صاحب، محترم نصیر ترابی صاحب، محترم شکیل عادل زادہ صاحب، محترم خواجہ رضی حیدر صاحب، محترمہ شاہدہ حسن صاحبہ اور محترم صلاح الدین درویش صاحب کی انتہائی ممنون ہوں جنھوں نے اپنا قیمتی وقت صرف کر کے کتاب پر رائے دی۔

تسنیم عابدی

....

خیر مقدم

وطن سے دور اُردو کا چراغ جلائے رکھنے والوں میں ایک روشن نام تسنیم عابدی کا ہے۔ سال ہا سال خلیج میں اُردو کی تدریس جاری رکھنے کے بعد اب وہ امریکا میں یہی فریضہ انجام دے رہی ہیں۔

دنیائے ادب میں تسنیم کا نام نیا نہیں۔ وہ ایک خوش گو شاعرہ ہیں جن کے دو مجموعے، ''صحرا، آنکھیں اور تنہائی'' اور ''تماشا'' کے عنوان سے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ آخر الذکر پر اُردو مرکز لاس اینجلس کی طرف سے ایوارڈ بھی دیا گیا۔ نعت و منقبت کا مجموعہ ''چراغِ بصیرت'' ان کے علاوہ ہے اور خاکِ مدینہ و نجف سے تسنیم کے رابطِ استوار کا آئینہ دار۔

اور اب یہ تازہ مجموعہ جو غزل اور نظم دونوں سے تسنیم عابدی کے یکساں شغف کا پتا دیتا ہے۔ انھیں ان دونوں اصناف کے مزاج اور تقاضوں کا بخوبی اندازہ ہے۔ چناں چہ نظموں میں ان کا لہجہ واشگاف ہے جب کہ غزلیں رمز و ایما کا رنگ لیے ہوئے ہیں۔

تسنیم عابدی کی غزل سبک، رواں اور دل نشیں ہے جو روایت سے جُڑی ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی تازگی کو کامیابی سے برقرار رکھتی ہے۔ ان کی غزلوں میں دو کیفیتیں غالب نظر آتی ہیں، ایک حیرت جو تسنیم کی نگاہ میں عمرِ رواں کا مآل ہے اور دوسرے لاحاصلی کا احساس جس کے تحت اسے زیست کا سارا سفر رائیگاں دکھائی دیتا ہے۔ شاید اس کے پس منظر میں ان کے اندر پیہم اڑتی ہوئی وہ گرد ہو جس کے بارے میں انھوں نے کہا ہے:

دشتِ دل میں کبھی اک ناقہ سوار آیا تھا
آج تک مجھ میں بہت گرد اڑا کرتی ہے

میں تسنیم عابدی کے اس دیوانِ تازہ کا خیر مقدم کرتے ہوئے خوشی محسوس کرتا ہوں، اس امید کے ساتھ کہ اسے بھی، ان کے گزشتہ مجموعوں کی طرح ذوق وشوق سے وصول کیا جائے گا۔

خورشید رضوی

....

”ردائے ہجر“— مکمل شخصیہ

سرِ حال اکیس ویں صدی کے دوسرے عشرے کی وسطی شاہراہ سے حسرتوں کا ایک ہجوم گزر رہا ہے۔ وقت کی طبیعات اور زندگی کی کیمیا، اپنے دباؤ اور پھیلاؤ سے، ہر کس و ناکس کو ہمہ رُخ آرائش و نمائش کا اُکساوا اور بڑھاوا دے رہی ہے۔ ایسے ماحول میں ظاہر کاری اور ناہمواری کے ماحول میں چند دل زدوں کا اپنے خمیر و ضمیر سے دوٹوک وابستہ رہنا گویا جاں کنی کا سودائی ہوتا ہے۔ یہ سودا وہ فائق فضیلت ہے جس میں داخلی و باطنی صورتِ حال آلائشوں سے دُور رہتی ہے۔ یہ دُوری احساس کو انفرادی احاطے سے نکال کر آفاقی حلقے میں لے آتی ہے۔ آفاق تک رسائی حسّاس زندگیوں کا ہدف ہوتی ہے۔ شعری مجموعے کا سرنامہ ”ردائے ہجر“ تسنیم عابدی کے حسّاس وجود کی طرح حسبی و نسبی مرکب ہے۔ عزتِ نفس کی آبرو رکھنے والوں کے نزدیک ”ردا“ وہ معنوی حصار ہے جو تہذیباً عزت داری اور گوشہ کشی کے اجزائے ترکیبی کی فہرست میں آتا ہے۔ اب رہا ہجر کا مرحلہ تو یہ ہجر کسی بھی وجود کے اطراف ایسے غلاف کے مانند ہوتا ہے جس طرح پھلوں کے اردگرد چھلکے ہوتے ہیں۔ اس صراحتی حوالے سے ”ردائے ہجر“ کو غیرت و حمیّت کی چار دیواری کا استعارہ سمجھنا چاہیے۔ ہجر کی آمد عموماً غیر دعوتی ہوا کرتی ہے، لیکن ہجر کی تواضع اختیاری ہوتی ہے۔ خاطر تواضع سے ہجر کشاں کشاں اہلِ ہجر کی روحانی سرگرمی کا ثمرہ ہو جاتا ہے۔ سرگرمیوں کے ذیل میں تکیے بھگونا اور ان بھیگے تکیوں کا خوابوں سے دیر تک سرگوشی کرنا اور ہم کلام ہونا ریاضتاً تہجد گزاری سے کم نہیں ہوتا۔ ”ردائے ہجر“ کی پردگی میں تسنیم نے اپنی روحانی ریاضتوں کو خاصا فروغ فراہم کیا ہے۔ فعلاً تسنیم کو ہجر کی صحبتوں میں اب خوش باش رہنے کی عادت سی پڑ گئی ہے اور وہ تنہائی کی گرانی پر قدرے آسانی سے قابو پانے کا ہنر بھی سیکھ گئی ہے۔

تسنیم کی نسائیت ایک مہذب رجائیت سے آشنا ہے۔ بلاکم وکاست الفاظ جمانے اور مصرع بنانے کی موجودہ اشتہاری روایت سے تسنیم دانستہ گریزاں ہے۔ گریز کی یہ تربیت شدہ پابندی تسنیم کا وجدان ہے۔ تسنیم کے لیے وجدان، حضوریت کا وہ روشن علاقہ ہے جہاں پہنچ کر نابینا سوال کو آنکھیں مل جاتی ہیں اور لاینحل اعتراض کی تحلیل ازخود ہو جاتی ہے۔ ''ردائے ہجر'' کی لفظ گردانی یہ بھی مطلع کرتی ہے کہ تسنیم لفظ کا برتاؤ بھی ٹھیک ٹھاک جانتی ہے۔ وہ اس رمز سے بہ خوبی واقف ہو چکی ہے کہ لفظ کبھی کبھار معنی کے بغیر بھی اپنی چمک دکھاتا ہے، یعنی جس طرح الاپ میں لفظ کی جگہ متبادل کشش اجاگر ہو سکتی ہے۔ ہر چند کہ تسنیم کے ہاں شعور اور شعار کی یک جائی شعر کا تشکیلی جواز ہے، لیکن پسِ تشکیل شعروں کی غم پذیری میں تسنیم کے شعور کو چنداں دخل نہیں بلکہ اس کا وجدان اپنا ایک جُداوفور رکھتا ہے۔ اس وجدانیت سے تسنیم کا غم انجذابیت کا حامل ہو جاتا ہے۔ یہ انجذابی نوعیت تسنیم کا وہ جوہری حسن ہے جسے محبت کہا جائے۔ محبت تسنیم کا وہ کرشمۂ دسترس ہے جو وقت کی کج ادائیوں کو اپنی اُداسیوں سے تراشنے اور سنوارنے کی شدید خواہش میں مبتلا ہے۔ خواہش کی یہ شدّت تسنیم کے ہاں محبت، دو میں ایک اور ایک میں دو کی قائم مقامیت کا سیاق وسباق ہو جاتی ہے۔ بیش وکم گزشتہ تین دہائیوں سے اس دشت کی گردشوں کے باوجود تسنیم کی چہکار تسنیم کی اعتکافی یک سوئی کا نتیجہ اور منصوبہ بند احتیاط کا شاخسانہ معلوم ہوتی ہے۔ احتیاط تمیز وتہذیب کی طرح معتبر اور قابلِ لحاظ صفت ہوتی ہے۔ لحاظ کسی بھی فرد کی وہ تسلیمہ حیثیت ہے جس سے کوئی نہ کوئی نسبتِ شرطیہ منسلک ہوتی ہے۔ اس اعتباری کلیے سے میرے تئیں تسنیم کی گرہ میں معتبری اور لحاظ مندی اپنا ایک نامیاتی تاثر رکھتی ہے۔

''ردائے ہجر''، تسنیم کا ایک مکمل شخصیہ ہے، معلوم نامعلوم کی ابتلا میں سرگرداں شخصیہ ...

نصیر ترابی

....

حیات آشنا شاعرہ — تسنیم عابدی

میں خواتین کی شاعری کے ضمن میں کوئی ایسا شارح نہیں ہوں جو خواتین کی شاعری کے حوالے سے کوئی قابلِ ذکر تجزیے پیش کر سکے، مگر اس کے باوجود میں اس خوش گمانی میں مبتلا رہتا ہوں کہ شاعری شاعری ہوتی ہے، وہ چاہے مردوں کی ہو یا عورتوں کی۔ ایسی صورت میں اس شاعری کے حوالے سے رائے دینے کا مجھے حق ضرور حاصل ہے، مگر یہ حق اُسی صورت میں بامعنی ہوسکتا ہے جب میں خواتین کی شاعری کے بارے میں کوئی ایسا انکشاف کرسکوں جو تفکّر آمیز بھی ہو اور معنی خیز بھی۔ میری یہی محدودات ہیں جن کی وجہ سے میں نے خواتین کی شاعری پر بس حاضری لگانے کی حد تک چند ایک مضامین لکھے ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں ہمارے عہد کی ایک صاحبِ طرز شاعرہ محترمہ تسنیم عابدی کی شاعری پر کوئی سیر حاصل گفتگو کرنا شاید میری زندگی کا ایک مشکل مرحلہ ہے۔ تسنیم عابدی کے شعری مجموعے ''روائے ہجر'' کے مسوّدے کی متعدد بار خواندگی کے باوجود اُن کی شاعری کے حوالے سے میں کوئی ایسا تھیسس نہیں بنا سکا جو اُن کی شاعرانہ خوبیوں کا مکمل احاطہ کر سکے۔ یہ صورتِ حال جہاں میری کم مائیگی کی دلالت کرتی ہے، وہاں تسنیم عابدی کی ایک بڑی خوبی کی بھی ترجمان ہے، یعنی تسنیم عابدی کا اسلوبِ اظہار اور شعری موضوعات اتنے وقیع ہیں کہ اُن سب کو کسی ایک ہی تفہیمی پیرائے میں سمیٹا نہیں جا سکتا۔

یہ ٹھیک ہے کہ میں شخصی طور پر تسنیم عابدی سے بہت کم واقف ہوں، لیکن گزشتہ دو عشروں سے اُن کی شاعری رسائل و جرائد میں میری نگاہ سے نہ صرف گزرتی رہی ہے بلکہ یہ شاعری اپنے حوالے سے میرے اندر ایک واضح رائے بھی قائم کرتی رہی ہے۔ اب جب کہ اُن کا مجموعہ میرے پیشِ نظر ہے تو مجھے پہلے مرحلے پر یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ تسنیم عابدی کی شاعری میں محبت کی مہک اور مٹھاس کے ساتھ شکستِ خواب کی الم ناکی اور ایک وسیع تر زندگی کی ترجمانی موجود ہے،

یعنی زندگی اپنی کلّیت کے ساتھ اُن کی شاعری میں موج زن ہے۔انھوں نے اپنی ذاتی اور جذباتی زندگی سے جڑے ہوئے تمام موضوعات کو اپنے تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ یہ تمام موضوعات اُن کی دیگر معاصر شاعرات کے ہاں بھی اظہار پاتے رہے ہیں،لیکن ان موضوعات کے اظہار میں جس تخلیقی سنجیدگی کا تسنیم عابدی نے مظاہرہ کیا ہے وہ فی زمانہ دیگر شاعرات کے ہاں کم کم ہی دکھائی دیتا ہے۔اُن کی بیشتر غزلیں ایک مزاج کی غزلیں ہیں، ان غزلوں میں ایک ایسی کیفیت موج زن رہتی ہے جو جذباتی فضا کو بڑھاوا دیتی ہے اور اظہار کو ترفع کی جانب لے جاتی ہے۔

تسنیم عابدی کی شاعری کی اساس خالص روایتی اُردو اور فارسی غزل کی مقتضیات پر استوار ہوتی ہے۔اس لیے لب و لہجے میں جدید ہوتے ہوئے بھی اُن کی شاعری اپنے تشخص میں اُردو کی اہم اور بڑی شاعری سے جُڑی ہوئی ہے۔ بقول سلیم احمد ''شاعری ہو یا زندگی ہمیں اپنے سلسلۂ نسب کا پتا ضرور دینا چاہیے۔ یہ بات بعد میں دیکھنے کی ہوتی ہے کہ ہم صرف شجرہ پرستی کر رہے ہیں یا ہم نے اپنے آپ کو دریافت بھی کیا ہے۔'' تسنیم عابدی کی شاعری بھی اپنی دریافت اور بازیافت کا ایک ایسا اضطرابی اور اضطراری عمل ہے، جس نے ان کے اندر جستجو اور گہرا تانیثی شعور بیدار کر کے اُن کی شاعری میں وحدت اور تنوع کی ایک ایسی یک جائی کو جنم دیا ہے جو عموماً بڑی شاعری کی اساس ہوتی ہے۔وہ اپنی زندگی کے مدو جزر کو خبر کی طرح پیش نہیں کرتی ہیں، بلکہ اپنے ہر تجربے کی تخلیقی معنویت پر غور کر کے اُسے اس طرح سے اپنے اظہار کا حِصّہ بناتی ہیں کہ تجربے کی معروضیت بھی برقرار رہتی ہے اور تخلیقی معنویت بھی دو چند ہو جاتی ہے۔تسنیم عابدی اس حقیقت سے پورے طور پر واقف ہیں کہ شاعری میں ذاتی کیفیات اور احساسات کے گہرے شعور کے بطن سے ہی ہمیشہ تہ دار معنویت جنم لیتی ہے۔تسنیم عابدی کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

ہوائے وحشتِ دل تیز چل رہی ہے بہت
ردائے ہجر مرا سر کھلا نہ رہ جائے

اس سے پہلے کہ ترا دشت مجھے راس آ جائے
اپنی وحشت کو اٹھاؤں گی چلی جاؤں گی

ہائے وہ رنگ جو اُبھرا مری بے دھیانی میں
ہائے وہ نقش جو بنتا گیا انجانے میں

میں اپنی آنکھ کی تصویر گر ہٹا لوں تو
نگار خانۂ عالم ہے کیا سوائے نظر

وحشتِ دل نے بہت دیر تماشا دیکھا
خود کو آشفتہ بیانی کے حوالے کرکے

چشمِ ادراک کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ اب
درد سن سکتے ہیں خوشبو کو پکڑ سکتے ہیں

سب اپنا اپنا تعارف کرا رہے تھے مگر
گلے لگا کے لیا میرا نام وحشت نے

یہ زندگی تو ترے ساتھ ساتھ ختم ہوئی
جو مجھ میں باقی ہے وہ لازوال حیرت ہے

مجھ کو خود میں قیام کرنا تھا
ورنہ رستے پڑے تھے قدموں میں

ہوا یہ حال کہ بے حال ہو گئے ہم تو
بنامِ عشق عجب مرحلے میں رکھا گیا

کچی پکی شاعری کے حوالے سے زندگی بسر کرنے والی خواتین کے لیے تسنیم عابدی کی شاعری تفہیمی مرحلے میں سوالیہ نشان بن جاتی ہے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے اطراف ہونے والی اس حاسدانہ کُھسر پُھسر سے گھبرا کر بے سمت رفیقانِ سفر سے رسم و راہ دراز نہیں کرتی ہیں، بلکہ

سنجیدہ غور وفکر کا ہاتھ تھامے اپنے ہونے کا مسلسل ثبوت فراہم کرتی رہتی ہیں۔لہٰذا تخلیقی انہماک اور شعری اوصاف ومحاسن تک رسائی کی جب بھی کوئی سنجیدہ کوشش ہوگی تو تسنیم عابدی کا ذکر اہم شاعرات، بلکہ اہم شعرا کے ساتھ آ جائے گا۔ وہ اپنی کسی ذہنی رو اور اپنے کسی خیال واحساس کو باآسانی شاعری بنا دیتی ہیں۔اُن کو نہ اپنے کسی خیال سے ڈر لگتا ہے اور نہ اُس کے اظہار کی راہ میں کوئی مصلحت آڑے آتی ہے۔ایسی صورت میں اُن کی شاعری اظہار کی ایک ارفع صورت کی نمائندگی کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ دراصل کسی خیال یا مشاہدے کے اظہار میں مؤثریت اور تاثیر اُسی صورت میں پیدا ہوتی ہے کہ جب شاعری کے فنی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے خیال یا مشاہدے کی معروضیت اور معنوی امکانات کو اجاگر کیا جائے۔

ہمارے جدید ادب کا غالب عنصر اور ذہنی ماحول بڑی حد تک مغرب سے مستعار ہے، لیکن تسنیم عابدی نے مغربی ادب وشعور سے کماحقہ واقفیت کے باوجود مشرقی روایت کا دامن نہیں چھوڑا ہے۔موضوعات کے اعتبار سے بھی اور لفظیات وتراکیب کے اعتبار سے بھی۔ لہٰذا اُن کی تمام شاعری اُن کے انفرادی تشخص کی آئینہ دار شاعری ہوگئی ہے۔ایک بات اور یہ ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری کو مروّجہ یکسانیت اور بے ہنگم شور سے بچانے اور بامعنی بنانے کے لیے اپنے شاعرانہ وفور وشعور کو محتاط اور بھرپور انداز میں ظاہر کیا ہے۔ وہ خاموشی کو گفتگو اور گفتگو کو منطقی اثباتیت سے کثیرالمعنی بنا دیتی ہیں، کیوں کہ وہ اس رمز سے آشنا ہیں کہ بلاغت کا اہم وصف یہ ہوتا ہے کہ خاموشی اور گویائی یک جان ہو جائیں۔اگر چہ انھوں نے مابعدالطبیعاتی مسائل ومعاملات کے اظہار سے کہیں کہیں اپنی شاعری کو بوجھل کرنے کی کوشش کی ہے مگر مصرعوں کا بہاؤ کہیں پر بھی مجروح نہیں ہوا ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ تسنیم عابدی کے موضوعات بڑے مختلف الجہات ہیں۔ وجود وعدم، روح وبدن، حسن وعشق، آب وخاک، من وتو، بود ونابود، ہجر ووصال، یقین وگمان، وحدت وکثرت، عکس وآئینہ، وحشت وحیرت، فنا وبقا، گل وکوزہ، پیاس ومشکیزہ، جبر وقدر، ظلم وانصاف اور فنا وبقا کے علاوہ صنفی امتیازات، نسائی حساسیت وغیرہ ایسے موضوعات ہیں جن کو شاعری کا موضوع بنانا شاید کسی عام شاعرہ کے بس کی بات نہیں، لیکن تسنیم عابدی نے ان تمام موضوعات کو بڑے سلیقے سے برتا ہے۔ایسا لگتا ہے کہ اُن کی شاعری ایک مرتب ومہذب خاتون کی شاعری ہے، جس میں نہ روایتی اخلاقیات سے کوئی انحراف موجود ہے اور نہ ہی کسی قسم کی سطحیت۔ اُن کی شاعری اپنی کلّیت میں ذات وکائنات کے اظہار کی ایک ایسی جستجو ہے جو ہر لمحہ متخیلہ کو مہمیز

کرتی رہتی ہے:

کبھی محرومِ تماشا نہیں ہونے دیتی
آئنے تجھ میں جو یہ دیدہ وری رہتی ہے

اب کسی اور سفر کے لیے قائل نہ کرو
زندگی ساری مسافت میں گنوا بیٹھے ہیں

آئنہ خانے سے کچھ بھی نہیں مل پایا مجھے
میں نے جب دیکھنا چاہا کبھی حیرت کے بغیر

دشتِ دل میں کبھی اک ناقہ سوار آیا تھا
آج تک مجھ میں بہت گرد اڑا کرتی ہے

ہر ایک موجِ تمنا نے سر اٹھا کے کہا
سوالِ تشنہ لبی اٹھ گیا تو کیا ہوگا

جو آرہا ہے نظر وہ اگر نہ ہو، کیا ہو
اگر وجود عدم ہی کا ایک وقفہ ہو

میں تو حیران پریشان یہی سوچتی ہوں
آئنہ خانے سے حیرت بھی چلی جائے اگر

ہوائے شہرِ تمنا بجھا کے چھوڑ گئی
چراغ جانتے ہیں اُن کا کام ہونے کو ہے

بگولے خانۂ وحشت میں کر رہے ہیں طواف
کہ قیس دشت سے نامِ خدا چلا گیا ہے

وہ خیمہ گاہِ محبت تو جل گئی کب کی
اور اُس کی راکھ میں مدت سے نیم جاں ہوں میں

محبت تسنیم عابدی کا ایک روحانی تجربہ ہے جو اُن کی شاعری میں محذوف اور معلوم طور پر ظاہر ہوتا ہے، مگر محبت کی وارفتگی سے زیادہ اُن کے ہاں عالمِ اسباب اور عالمِ وجود کے حوالے سے تحیّر کی فراوانی دکھائی دیتی ہے۔ کسی نے کہا تھا کہ سخن، صاحبِ سخن سے ہٹ کر کچھ بھی نہیں ہوتا ہے۔ مجھے تسنیم عابدی کے سخن میں صاحبِ سخن کی جابجا پرچھائیاں لہراتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ گویا وہ خود سے مکالمہ کرتی ہوئی ایک ایسی شاعرہ ہیں جو اپنے خیال اور احساس میں اپنے قاری کو شریک کرنا اپنی اخلاقی ذمے داری تصور کرتی ہیں:

زندگی روز طلب کرتی ہے، مجھ سے مجھ کو
اور میں ہاتھ جھٹکتی ہوں، گزر جاتی ہوں

جیسے خوشبو کو سلیقے سے صبا لے جائے
کوئی ایسے ہی مجھے مجھ سے چُھڑا لے جائے

حبس جب حد سے بڑھا جسم کے ویرانے میں
رُوح نے بین کیا دل کے عزا خانے میں

دُعا کے کاسے کو خود ہی الٹ دیا میں نے
مری کہانی کا اب اختتام ہونے کو ہے

اتنی سی بات میں سمٹی تھی کہانی ساری
اُس کی میں ہو نہ سکی اور وہ مرا ہو نہ سکا

میں ایک شامِ الم اور تُو ہے صبحِ طرب
اسی لیے ترے سانچے میں ڈھل نہیں پائی

بس اک نگاہ پر خوش فہم دل دھڑک اٹھا
جو سچ کہوں تو کوئی ایسا سلسلہ بھی نہیں

اس آئنے سے نکل اور خود کو تنہا کر
کبھی تو سامنے آ کر کوئی تماشا کر

میں خالی ہاتھ بس اب آسماں کو تکتی ہوں
دعا کے ساتھ ہی حرفِ دعا چلا گیا ہے

نجانے کیسی گزرتی ہے جانے والوں پر
کوئی بتاتا نہیں رفتگاں کے بارے میں

تسنیم عابدی کی شاعری بلاشبہ اُردو کی اہم شاعری سے کندھا ملاتی ہوئی شاعری ہے۔ ایک ایسی شاعری جو رسمی اسالیبِ اظہار سے گریزاں کسی تازہ لب و لہجے کو آواز دیتی رہتی ہے۔ حیرت اور استعجاب میں ڈوبی ہوئی شاعری جس میں تازہ کاری کے ساتھ معنی کی پرتیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔ مجھے اُن کے ایک باکمال اور خوش خیال شاعرہ ہونے کا اس لیے بھی یقین آتا ہے کہ فکر اور جذبے کی فراوانی نے اُن کی شاعری کو حیات آشنا بنادیا ہے اور حیات آشنائی ہی دریافت و بازیافت کی کلیدِ اوّل ہے۔

جہاں تک تسنیم عابدی کی نظموں کا تعلق ہے، وہ بھی تخلیقی اظہار کی نمائندہ نظمیں ہیں۔ نظم گوئی موضوع کے حوالے سے جس احساس و آہنگ کے باہمی ارتباط کی متقاضی ہوتی ہے، اُس سے غزل گو شاعر اپنی تخلیقی ریاضت کی بنا پر نہایت عمدگی سے عہدہ برآ ہو جاتا ہے۔ نظم چوں کہ ایک مسلسل اور مکمل تخلیقی اکائی ہوتی ہے، اس لیے مرکزی خیال اور اُس سے جڑی ہوئی دیگر کیفیات کا اظہار غزل کا شاعر ہی بہتر طور پر کرسکتا ہے۔ اسی لیے غزل کے شاعر کی نظموں میں خیال کے ربط کے ساتھ ہی ساتھ نغمگی، غنائیت، خوش سلیقگی اور معنویت و شعریت زیادہ واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔ تسنیم عابدی کی نظموں میں بھی یہ تمام اوصاف نہ صرف موجود ہیں، بلکہ ایک مکمل وحدت کے طور پر ظاہر ہوئے ہیں۔ خصوصاً ان کی نظمیں ''عشق کی سلگتی آگ''، ''عالمِ عجلت''، ''نور کا بوسہ''،

''گریۂ تحیر''، ''ایک نظم تمھارے لیئے''، ''بین الاقوامی منظر نامہ''، ''کچا رنگ''، ''حرکتِ معکوس'' وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جن کو ہر تجزیے میں مکمل نظمیں قرار دیا جاسکتا ہے۔ مگر اس خوبی کے باوجود تسنیم عابدی کی غزل اپنی ایک علاحدہ رفعت رکھتی ہے۔ وہ فلسفے کو شاعری بنا دیتی ہیں، شاعری کو فلسفہ نہیں بناتی ہیں، جس کی بنا پر نہ صرف اُن کے اندر کی شاعرہ متحرک رہتی ہے، بلکہ اُن کی شاعری بھی نئے امکانات کے در باز کرتی رہتی ہے۔

اپنے اطراف کی زندگی میں موجود انسانی رویوں اور انسانی احساسات کو اُن کی گہرائی اور گیرائی کے ساتھ دریافت کرنے اور اُن کی شاعرانہ صورت گری ہی دراصل کسی شاعر کا سب سے اہم تخلیقی تجربہ ہوتا ہے۔ تسنیم عابدی اپنی شاعری کے تناظر میں اس تخلیقی تجربے پر پوری اترتی نظر آتی ہیں۔ ویسے بھی انسانی جذبات و احساسات کا جس قدر بے ساختہ اظہار اُن کی شاعری میں موجود ہے، اُس کے سبب سے اُن کی شاعری جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ''حیات آشنا'' ہوگئی ہے۔ رومانویت اور جمالیات جب باہم گلے ملتی ہیں تو جہاں عشق دو آتشہ ہو جاتا ہے وہاں اُس میں سماجی اور ذاتی بصیرت کے تمام تر امکانات واضح ہو جاتے ہیں۔ یہ امکانات تسنیم عابدی کی شاعری میں نہ صرف ظاہر ہوئے ہیں، بلکہ ان میں اظہار کی دل آویزی بھی شامل ہوگئی ہے۔ کیوں کہ تحتِ الفاظ اشاراتی معنویت اپنا ایک علاحدہ حسن رکھتی ہے۔ میں تسنیم عابدی کو ''ردائے ہجر'' کی اشاعت پر مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ اس شعری مجموعے میں انھوں نے اپنی تخلیقی شخصیت کو وسعت دی ہے۔

خواجہ رضی حیدر

....

ردائے ہجر میں لپٹا پُرملال لہجہ

تسنیم عابدی میری ہم عصر شاعر ہیں۔ یہ عصر جو اک عالم گیر انتشار کا شکار ہے اور جس میں ہماری وہ نسل جو قیامِ پاکستان کے بعد پیدا ہوئی ہے، اک ایسے کم علم اور فرسودہ سماج میں زندگی کے تقاضوں سے نبرد آزما ہے جو سماجی، فکری اور نفسیاتی سطح پر ان گنت تضادات اور نفاق کا شکار ہے۔ ایسے میں انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر اک حالتِ جدال میں عمر بتانی پڑتی ہے۔

تسنیم عابدی بھی شعر گوئی کے اس سفر میں اپنے اضطرابِ نہاں کے انھی پُر پیچ مرحلوں سے گزرتی رہی ہیں اور گزر رہی ہیں۔ کہتی ہیں:

عمر رشتوں کے تقاضے ہی نبھاتے گزری
زندگی نے مجھے اپنا کبھی ہونے نہ دیا

کبھی یوں سوال کرتی ہیں:

اے سرابِ غمِ ہستی یہ بتا دے مجھ کو
اک قدم اور تمنا کا کہاں رکھنا ہے ؟

غالب کی اداشناسی اور رمز شناسی سے کون دستبردار ہو سکتا ہے کہ غالب کی فکر نے ہر عہد کے سوچنے والے ذہن کو متاثر کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگانی کے سوالات ہمیشہ سے بے شمار رہے ہیں مگر جواب کوئی بھی نہیں۔

تسنیم عابدی بھی یوں ہی تلاشِ ذات کے سفر میں مبتلا، سوالات کے جُھرمٹ میں گھری، معاملاتِ حیات پر غور کرتی، ٹوٹتی بکھرتی، ہجرت کی کٹھنائیوں اور بے زمینی کے دکھ سے نبرد آزما مشرقی تہذیب و معاشرت کے خواص کو اپنی ذات میں سمیٹتی، جسم و روح کے تقاضوں کو نبھاتے نبھاتے ریزہ ریزہ ہوتی، حیرت و ملال کے اک گرداب میں پھنسی ہیں اور اس لامحدود زندگی کے

بے انت پھیلاؤ میں کسی ایسے سِرے کی تلاش میں ہیں جو انھیں حقیقتِ حیات کے اصل مفہوم سے آشنائی کی نوید دے سکے۔

اپنے تیسرے شعری مجموعے ''تماشا'' سے اپنے اس تازہ شعری مجموعے ''ردائے ہجر'' تک کا سفر، تسنیم عابدی نے بڑی بُردباری سے طے کیا ہے ان کے شعری مجموعے ''تماشا'' پر خیالات کا اظہار کرتے ہوئے میں نے کہا تھا کہ تسنیم کے شعری اظہار میں اپنے جیسے انسانوں سے مسلسل مکالمہ جاری رکھنے کی شدید خواہش موجود ہے۔ اس خواہش میں شائستگی، لطف اندوزی اور مشرقی تہذیب کی نمائندگی بھی نظر آتی ہے اور عہدِ حاضر کے سماجی، سیاسی اور تہذیبی منظرنامے سے بھرپور وابستگی بھی۔

''ردائے ہجر'' کے شعری اظہار تک آتے آتے تسنیم عابدی نے اپنے جذبوں اور فکر و خیال کی صداقتوں کو زیادہ مہارت کے ساتھ گرفت میں لیا ہے۔ اب ان کے موضوعات میں تنوع بھی ہے اور ذاتی تجربوں کی وہ آنچ بھی جو ساعتِ ہجر سے وصل کی سرشاریاں کشید کرسکتی ہے۔ اس شعری مجموعے میں شامل غزلیں اور نظمیں اپنی مجموعی فضا کے اعتبار سے اک وحدت کی حامل نظر آتی ہیں اور کسی نسائی وجود کی اُس سائیکی کو آئینہ دکھاتی ہیں جہاں پدرانہ نظام اور صنفی امتیاز پر قائم سماجی تصورات کے حامل معاشرے میں اپنے انفرادی وجود پر اصرار کرنے والی حساس عورت، ایک جانب زندگی کے جدید تقاضوں اور دوسری جانب فرسودہ رسم و رواج کے درمیان موجود تضادات کے سبب، چکّی کے دوپاٹ کے بیچ پسنے والے اناج کی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہورہی ہو:

ہوائے وحشتِ دل تیز چل رہی ہے بہت
روائے ہجر مرا سر کُھلا نہ رہ جائے
خدا کے نام پہ جس طرح لوگ مر رہے ہیں
دعا کرو کہ اکیلا خدا نہ رہ جائے

کارگاہِ حیات میں آبگینے کی طرح ٹوٹتے بکھرتے، ہر لمحہ رنگ بدلتے یہ ناپائیدار روز و شب، تقدیر کا یہ جبر، ہونے نہ ہونے کی یہ خلش، یہ وجود و عدم کی کہانی، یہ فنا و بقا کی داستان، یہ بود و نبود کی بُھول بھلیّاں۔ غرض یہ کہ تسنیم عابدی کی شاعری اب ان سارے تضادات کو سمجھنا اور سمجھانا چاہتی ہے۔ انھوں نے حیات کے ظاہری اور باطنی معاملات کو موضوع بنا کر یہ شعری پیکر تراشے ہیں:

عدم ، وجود ، عدم ، اُف یہ سلسلے کیسے
میں لُٹ گئی ہوں مگر مالا مال حیرت ہے
یہ زندگی تو ترے ساتھ ساتھ ختم ہوئی
جو مجھ میں باقی ہے وہ لازوال حیرت ہے

ہستیِ خوش گماں سنبھل، سوچ سمجھ کے چال چل
عالم نیست نے ہر اک نام و نشاں کو کھا لیا
تذکرے رہ گئے فقط وہ بھی ہیں کتنی دیر تک
تو نے سکوتِ بیکراں، حرف و بیاں کو کھا لیا

ترے نصیب میں منزل کبھی نہ آئے گی
سفر تمام ترا دائرے میں رکھا گیا
ہوا کو یہ بھی بتایا کہ روشنی ہے کہاں
چراغ کو بھی ترے راستے میں رکھا گیا

تسنیم عابدی کی غزلوں میں ردیفوں کی معانی آفرینی خاصی پُرکشش ہے۔ اکثر غزلوں میں انھوں نے ردیفوں سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ فطرتِ انسانی کی حسیّات میں سب سے دیرپا اور ناقابلِ شکست جذبہ ''جذبۂ محبت'' ہے۔ یہ جذبہ تسنیم عابدی کے یہاں اک مرکزی موضوع کی حیثیت اختیار کر گیا ہے:

یہ ہے جہانِ آب و گل، کچھ بھی نہیں سوائے دل
میں ہوں جہاں، وہاں نہیں، پھر بھی مرا پتا سمجھ

اور پھر اگلی منزل یہ ہے:

سجدے ہزار کر لیے، پھر بھی یہ دل جُھکا نہیں
خود کو تو پہلے بھول جا، آئے گا پھر خُدا سمجھ

دشتِ دل میں کبھی اک ناقہ سوار آیا تھا
آج تک مجھ میں بہت گرد اڑا کرتی ہے

ہست و موجود ، کبھی بے خبری ایسی ہو
سب ہی معدوم لگے دیدہ وری ایسی ہو
بود و نابود کا آشوب نہیں رکنے دے
خاک اڑتی ہی رہے ، در بدری ایسی ہو

غزلوں کی طرح تسنیم عابدی کی نظموں کے خدوخال بھی جدید زندگی کے دکھ سکھ اور موجودہ رویوں ہی سے ابھرے ہیں۔ان نظموں میں کرب والم کے سائے بھی ہیں اور حیرت وملال کے سناٹے بھی۔

نظم ''نور کا بوسہ'' ، ''گریۂ تحیر'' ، ''ادھوری تصویر''، ''ایک نظم تمھارے لیے''، ''Mercy Killing''، ''فشارِ آگہی''، ''مکرو ریا کے سکّے'' اور اسی نوعیت کی دیگر نظمیں جسم و روح کے تقاضوں کے مابین ہونے والی کشمکش کو آئینہ دکھاتی ہیں اور عہدِ حاضر کے خیال انگیز تلازموں کے ساتھ سپردِ قلم کی گئی ہیں۔

''ردائے ہجر'' کی شاعری ہمیں یقین دلاتی ہے کہ تسنیم عابدی کا شعری سفر شعور و آگہی کی بخشی ہوئی روشنی میں اپنے تمام تر تنوع کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے اور اپنے قارئین کو، زندگی کی صداقتوں تک رسائی کا سلیقہ،اس گہرے احساس کے ساتھ سکھا رہا ہے کہ:

کیسا ہے رمزِ آگہی ، ایک بھی در نہیں کُھلا
چلتے رہے نہ کُم ہوا ، خود سے یہ خود کا فاصلہ

شاہدہ حسن

....

عورت ہونے کے ناتے

ہمارے تمدنی کوائف اور تاریخی شواہد کو اگر سامنے رکھا جائے تو عورت ایک ایسے وجود کے طور پر ہمارے سامنے آتی ہے کہ جس کی ترتیب وتشکیل میں معاشرے کے تمام مذاہب، اقدار، روایات، توہمات، قوانین، مسالک، نظریات اور پندونصائح اپنے حصے کی بہترین تعلیمات کا اظہار کرتے ہیں کہ جن کا مقصد فطرت کی طرف انتہائی خام شکل میں صورت پذیر ہونے والے وجود یعنی عورت کو اپنی من بھاتی وضع میں ڈھالنا ہوتا ہے، خود اُس خام وجود میں اپنی نمو کی صلاحیت، لیاقت یا جوہر بھی ہوسکتا ہے کہ جسے وہ اپنی تعمیر وتشکیل میں بروئے کار لانے کی اہل بھی ہوسکتی ہے، اُس کی طرف رجوع کرنا اور مذکور تعلیمات کے تمام بڑے اور چھوٹے بیانیوں میں اس جانب اشارے کو بھی درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ گویا عورت کی تعلیم وتربیت کا خاص اہتمام اس لیے کیا جاتا ہے کہ کسی طور ایک دندناتے، جارح جانور کو سدھایا جانا ممکن ہو سکے۔ پنجرے میں آٹھ پہر چکر کاٹتا شیر آزادی کی خواہش کو دبانے سے ہمیشہ قاصر رہتا ہے، لیکن جیسے ہی اُسے تماشائیوں کے پنڈال میں اُتارا جاتا ہے تو وہ آزادی کی خواہش کو غیر معقول سمجھتے ہوئے رِنگ ماسٹر کے ہنٹر کو اپنا نجات دہندہ سمجھتا ہے اور خاص دائرے سے باہر نکلنا اُس کے لیے گویا کوئی گناہ بن جاتا ہے۔ عورت بھی کوئی ایسا ہی شیر ہے، شیر کی طرح وہ بھی اپنے کمالِ فن کے اظہار کو نادیدہ رِنگ ماسٹروں کے کھینچے حصار میں ہی رہنے دیتی ہے۔

عورت جب بھی کبھی شخصی آزادی کے لیے سوالات اُٹھانے کی جرأت کرتی ہے تو وہ اپنے خشک حلق میں تھوک کی گولی نگل کر بڑی بے شرمی کے ساتھ کھسیانی ہنسی ہنس کر دوبارہ اپنی نشست پر بیٹھ جاتی ہے، جب اُسے یہ جواب دیا جاتا ہے کہ تمھاری عزت وتوقیر کا بندوبست تمھارے اُٹھتے

سوالات سے پہلے ہی کر دیا گیا ہے۔ پنجرے میں بند شیر کے اطمینان کو صرف شیر ہی جانتا ہے، رنگ ماسٹر کا ہنٹر اُس سے یکسر لاعلم ہے۔

عورت مذہب وملت اور اخلاق وتہذیب کے بڑے بیانیوں کا مقابلہ کرنے کی ابھی شاید کم اہل ہے۔ یہ جملہ میری بعض خواتین دوستوں کو بُرا لگ سکتا ہے، لیکن اس بات کو ہضم کرنا بھی سرِدست آسان نہیں ہے کہ مشرقی عورت ابھی تک اپنے کردار کی نمائشی سچائی میں ٹھیک ٹھاک آسودہ ہے، لیکن ایسی بھی کوئی زیادہ مایوسی نہیں ہے۔ مشرق کی وہ عورت کہ جو چادر اور چار دیواری کی مخصوص تعبیر کے ہوتے بھی اور اُس میں قدرے آزاد رہتے ہوئے بھی، تعبیر کے اس دائرے سے باہر اپنی معاشی آزادی اور سماجی سطح پر علمی، فنی اور فکری حوالوں سے عمل کی مردانہ دنیا میں پورے اعتماد، خلوص اور جرأت کے ساتھ شریک ہو چکی ہے، وہ مخصوص تعبیر کے متوازی اپنی ذات کی قدرے آزاد تعمیر وتشکیل کے باعث سچائیوں کے چھوٹے چھوٹے بیانیے منظرِعام پر لانے میں مسلسل کامیاب ہو رہی ہے۔ وہ کسی بھی بڑے بیانیے پر سوالات اُٹھانے کے بجائے خود اپنے ذاتی نجی اور گروہی زندگی کے مسائل ومعاملات سے نبرد آزمائی کے باعث اپنے حصے کی سچائیوں کو بیان کرنے پر قدرت حاصل کرتی چلی جا رہی ہے۔ چھوئی موئی، جی جی ہیں جی، اچھا جی کہتی ٹھس اور مرد بیزار عورتیں سر اٹھا رہی ہیں، وہ حکم ناموں کی غایت اور اُن میں چھپی توہین اور حقارت کی نفسیات کو سمجھ رہی ہیں۔ وہ اپنے شخصی علم وآگہی کے پراسس سے مردوں کے اجتماعیت پسند اجارہ دارانہ افکار کی دنیا میں گھس کر قومی، نسلی، مذہبی اور گروہی مفادات کا منہ چڑا رہی ہیں، انھیں بتا رہی ہیں کہ نظم وضبط اور اعتدال کے حصول کے لیے ایک زندہ اور دانا و بینا وجود یعنی عورت کو مردانہ حاکمیت کے قیام کے لیے ''قدرتی کھاد'' کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ تسنیم عابدی نے عورت ہونے کے ناتے مرد کو تناور درخت بنانے کے لیے کھاد بننے سے انکار کر دیا ہے، ایک ایسا دل آویز شعور اپنے فن میں سمویا ہے کہ جس کے ذریعے بحران کی نوعیت کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ ایک خوش گوار اور دوستانہ احساس بھی قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے:

میری تصویر دھنک رنگ نہ ہونے پائی
میرے خوابوں کو تری آنکھ نہیں دیکھ سکی

حسن کو سونپ کرسعی تو کرو
اس بے آب و گیاہ صحرا میں
کتنے چشمے اُبلنا چاہتے ہیں

یہ طنز نہیں ہے، گلہ یا شکایت بھی نہیں ہے۔ یہ تو اپنے کسی دوست کو اعتماد میں لینے والی بات ہے جو اپنے کسی احساسِ برتری پر یوں مطمئن ہے کہ جو اُس کی عظمت کے لیے جہانِ علم وفطرت نے طے کر دیا ہے وہی اصل ہے۔ تسنیم عابدی اپنے دوست کو اعتماد میں لینا چاہتی ہے اور بتانا چاہتی ہے کہ تمھاری اس سوچ کے دائرے نے میرا وقت بھی برباد کیا اور میری نمو کا راستہ بھی روکے رکھا ہے۔ یہ بغاوت اور احتجاج بھی نہیں ہے، بلکہ ڈھٹائی کو چھوڑ کر دانش مندی کا راستہ اختیار کرنے کی ترغیب ہے۔ تسنیم عابدی کی غزل ہو یا نظم ایک خوش گوار مکالمہ ہے جسے وہ ضروری سمجھتی ہے اور جانتی ہے کہ جی جی، آئی جی، اچھا جی ٹائپ بی بی بن کر موت کے منہ میں جانے سے کافی پہلے کوئی نہ کوئی بات جو بھیجے میں کہیں کُرلا رہی ہوتی ہے، کہہ دی جائے:

گیسو و عارض و لب ہی ترا معیار رہے
سنگِ مرمر کا بدن ہی ترا شہکار رہے

میں کچھ اس سے بھی سِوا ہوں تجھے معلوم نہیں
میں تری دوست ہوں لیکن تری محکوم نہیں

تسنیم عابدی کی شاعری میں لفظ تحیر جہاں بھی آیا ہے اپنے ساتھ معاملات کی پوری کہانی لے کر آیا ہے۔ اُسے حیرت بیشتر اس بات پر رہتی ہے کہ سامنے بیٹھا آدمی آخر اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے؟ وہ اپنے نیولے جیسے منہ پر کاہے کو اتراتا پھرتا ہے؟ عظمت اور وقار کون چڑیاں ہیں؟ وہ ان کے شوخ رنگوں سے بے خبر اپنے ایک جعلی اور سطحی جہانِ فکر کو ازل اور ابد کی سچائی جان کر ہواؤں میں اُڑا اُڑا پھرتا ہے کہ جس کا مقصد عورت کو اُس کے جہانِ اوقات میں رکھ کر ذلیل کرنا اور اپنی ساڈسٹ نفسیات کو تسکین دینا ہوتا ہے، وہ اس بات سے بے خبر ہوتا ہے کہ اُس کا مکالمہ تسنیم عابدی سے ہے، ایک دانا و بینا وجود سے کہ جسے اپنے اثبات کے لیے خود اپنا وجود ہی کافی وشافی ہے، لیکن وہ چاہتی ہے کہ جو مدِّ مقابل ہے وہ اُسے خاموش تماشائی نہ سمجھنے لگے:

مجھ کو نہ سرسری پڑھو دیکھو سنبھال کر رکھو
میری یہ خاک دیکھنا بنتی ہے کیسے کیمیا

جب آ گہی کے خد و خال دیکھتی ہوں کبھی
تو اپنے حسنِ تحیر سے ڈرنے لگتی ہوں

وہ اپنے کارِ جہاں میں لگا ہوا ہے مگر
اگر وہ آ نہیں سکتا تو اتنا ہی کر دے
مری طلب کو وہیں سے وہ بے طلب کر دے
مرے سوال کی طاقت کو چھین لے مجھ سے
میں تھک چکی ہوں تحیر کی آہ و زاری سے

غزل کا شعر اپنے معنوی باطن میں مکالمے ہی کی ایک شکل ہوتی ہے، سمجھنے سمجھانے کی ایک پروقار صورت، تسنیم عابدی کی غزل میں یہ مکالمہ دراصل یہ بات منظرِ عام پر لانا چاہتا ہے کہ جسے ہم دوافراد کے درمیان تہذیبی وتمدنی سطح پر کہتے ہیں وہ اُن دوافراد کے افکار وخیالات کے محض احترام سے جنم لیتی بلکہ ردّ وقبول کی مختلف صورتوں میں تشکیل پذیر ہوتی ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ کوئی بھی معقول بات جب ایک فرد کرے تو دوسرا اُسے پورے جذبے کی سچائی کے ساتھ قبول کرے اور اُسے اپنے حسیّاتی ادراکات کا حِصّہ بنالے مگر جب ایک فرد اپنے آپ کو خود مکتفی سمجھ بیٹھتا ہے تو وہ دراصل گونگا، بہرا اور اندھا ہوتا ہے، کسی دوسرے کے وجود کے اثبات کو اپنی توہین سمجھتا ہے۔ تسنیم عابدی کی شاعری میں ایسے گونگے بہرے اور اندھے لوگوں کو بتانے، سمجھانے اور کچھ دکھانے کی مختلف صورتیں نظر آتی ہیں:

تنقید کر رہا تھا کوئی خد و خال پر
میں محوِ آئنہ ہوئی صورت سنبھال کے

عجب حریف ملا تھا بہ صورتِ ہم دم
جو میرے ہونے کی تردید کرنے لگتا تھا

شریعتِ دل و دنیا اٹھائے پھرتی رہی
وہ کہہ رہا ہے مگر پھر بھی ناتواں ہوں میں

عورت ہونے کے ناتے کم ازکم تسلیم ورضا کی کوئی بھی صورت تسنیم عابدی کی شاعری میں ہمیں نہیں ملتی، ایسا ہونا محض کسی مثبت رویے کے اظہار کا کوئی خاص پہلو نہیں ہے بلکہ خود آ گہی کی کوئی ایسی پُرمسرت موج ہے جو اُسے اپنے جہانِ فکر میں مطمئن رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کی شاعری میں اپنی نفسیاتی الجھنوں کا بھی کوئی سراغ نہیں ملتا ہے۔ ایک متبسّم سا گریز ہے کہ جس کے باعث اُن کی غزل میں کلام کا حسن پیدا ہوگیا ہے۔ وہ بتانا چاہتی ہے کہ مرد اپنے جس مذہبی، نسلی، تہذیبی، سماجی یا تاریخی بیانیے کو اپنے شعور کی سند سمجھتا ہے، اُس نے اُس کی تکمیل میں کچھ ایسا بگاڑ پیدا کر دیا ہے کہ جس کی درستی اب اُس کے اختیار میں نہیں رہی، چناں چہ تسنیم عابدی گریز کو اپنے لیے خوش گوار بنالیتی ہے:

سگانِ کوچہ بہت شور کرنے لگ گئے تھے
سو ہم نے گھر میں ہی رہنے کا فیصلہ کیا ہے

تو اک پیادے کو شہ مات دینا چاہتا ہے!
میں ہار مان گئی اپنی چال رہنے دے

ہوئے ہو کس لیے برہم عزیزم
سرِ تسلیم ہے لو خم عزیزم

ڈاکٹر صلاح الدین درویش

....

تسنیم عابدی کی شاعری

تسنیم عابدی کو بجا طور پر معتبر شاعرہ کہا جاسکتا ہے، اس لیے نہیں کہ یہ ان کا چوتھا مجموعہ ہے۔ اس لیے کہ 80 کی دہائی سے اب تک یہ پوری سنجیدگی کے ساتھ مستقل مزاجی سے غزلیں اور نظمیں لکھ رہی ہیں۔ ان کے لہجے میں شائستگی، موضوعات میں تنوع اور ان کا اپنا طرزِ اظہار اس بات کی دلیل ہے کہ شاعری ان کا مشغلہ نہیں ماجرا ہے۔ ان کے کلام اور ذات میں تضادات نہیں۔ تسنیم عابدی نے اپنا شعری سفر کیسے طے کیا اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ ''صحرا آنکھیں اور تنہائی'' 1998ء میں شائع ہوا تھا تب بھی ان کے اظہار میں پختگی تھی۔ مجموعے میں غزلیں زیادہ، چند پابند نظمیں (مسدس میں) آزاد مختصر نظمیں روایت و جدت کے امتزاج اور ان کے مطالعے اور طبع کی روانی کا پتہ دے رہی تھیں۔ ایک اچھی شاعرہ کے مستقبل کے امکانات کا اندازہ بھی اس مجموعے سے ہو رہا تھا۔ مضبوط قدموں کے ساتھ ان کا شعری سفر جاری رہا، دوسرا مجموعہ ''تماشا'' اور تیسرا مجموعہ ''رِدائے ہجر'' آیا۔ میں پہلے مجموعے کے ان اشعار سے انھیں پہچانتی تھی۔

آنچل کو میرے سر سے اڑانے کی جستجو
اے موجِ ہوا یہ شرارت نہیں کرو
جیسا چنچل شعر اور پھر یہ سنجیدگی
کمک نہ آئے گی تم انتظار مت کرنا
یہ اہلِ کوفہ ہیں کچھ اعتبار مت کرنا

اس شاعرہ سے توقعات تو بجا تھیں۔ جب میں نے تسنیم عابدی سے یہ مقبول غزل سنی جو

''ردائے ہجر''میں ہے

سکوتِ عصر میں گونجی ہوئی اذان ہوں میں
بہت سے کرسی نشینوں کے درمیان ہوں میں

ادب کی کرب و بلا کوفۂ صدا ہے گواہ
ہوائے شام کا لکھا ہوا بیان ہوں میں

تو میں نے ان کے قلم کو رواں رہنے کی دعائیں دیں۔ جو سکوت کو سن سکتا ہے۔ اس میں آواز ہی نہیں اس کے پیغام کو بھی لکھ سکتا ہے، وہی غیر مرئی کو مرئی بنا سکتا ہے۔ یہ کمال ہے فن اور فن کار کا، سچے تخلیق کار کا۔ تسنیم نے اپنے تیسرے مجموعے تک یہ کمال حاصل کر لیا۔ شعر دیکھیے

بجز سکوت نہیں پاس کچھ سخن کے لیے
ہوں ماورائے صدا اہلِ انجمن کے لیے

تسنیم عابدی کی شاعری میں ابتداء سے ملال کا رنگ ہے۔ پہلے ہجرتیں پھر مستقل ہجر، تاحیات فراق کا کرب سہنا اور زندگی کو معمول کے مطابق بسر کرنا حساس شاعرہ کے اظہار میں اپنی شدت کے ساتھ آتا ہے مگر تسنیم اس شدت میں بھی لہجے اور لفظیات کو بے قابو نہیں ہونے دیتی۔ سلیقۂ اظہار دیکھیے۔

خلوصِ دیدۂ پُرنم تلاشتے رہیں گے
ہم اپنے زخم کا مرہم تلاشتے رہیں گے

تعلقات کی بے رنگ تتلیوں کے لیے
کشیدہ کاری کو ریشم تلاشتے رہیں گے

اس مجموعے میں شامل نظموں میں فکر و اظہار کی تہہ داری اور اپنے عہد سے وابستگی نمایاں ہے۔ ''خوفناک حسن''، ''آنکھوں کی ایش ٹرے''، ''ہاں دوست ایسا ہی تھا''، ''عصرِ حاضر کی قتل گاہ'' میں ان کا سیاسی، سماجی اور نسائی شعور نمایاں ہے۔ انھی نظموں میں ایک دھیمی دھیمی سی مختصر نظم میں

اس ازلی محبت کے جذبات کا حسن بھی نظر آیا جو کبھی ماند نہیں پڑ سکتا

رات کچھ بچھڑے ہوئے خوابوں سے پیمان ہوئے
دیر تک غور سے اِک دوسرے کو دیکھا کیے

اُس کی آنکھوں نے محبت کے سبق دُہرائے
میری آنکھوں نے بہت دیر تلک اُس کو پڑھا
ایک پیغام مجھے تم سے محبت ہے بہت
دوسرا یہ کہ تمھیں پانے کی حسرت ہے بہت
ان محبت کے سبق رٹتی ہوئی آنکھوں سے

میں نے بس اتنا کہا کاش ہو ادراک تمھیں
یہ محبت بھی عجب شئے ہے کہ پھر اس کے بعد
کسی پیغامِ تمنا کی ضرورت ہی نہیں
حالتِ حال بیاں کرنے کی حالت ہی نہیں

ان لکھی بات جو لکھی تھی نہیں پڑھ پائے
دل صحیفے کی تلاوت ہی نہیں کر پائے
اب کسی خواب کو دُہرانے سے حاصل کیا ہے
اَن کہی بات بیاں کرنے میں مشکل کیا ہے
عہدِ تجدیدِ محبت کی ضرورت کیا ہے!!!

فاطمہ حسن